ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اگست ۱۹۹۵ء

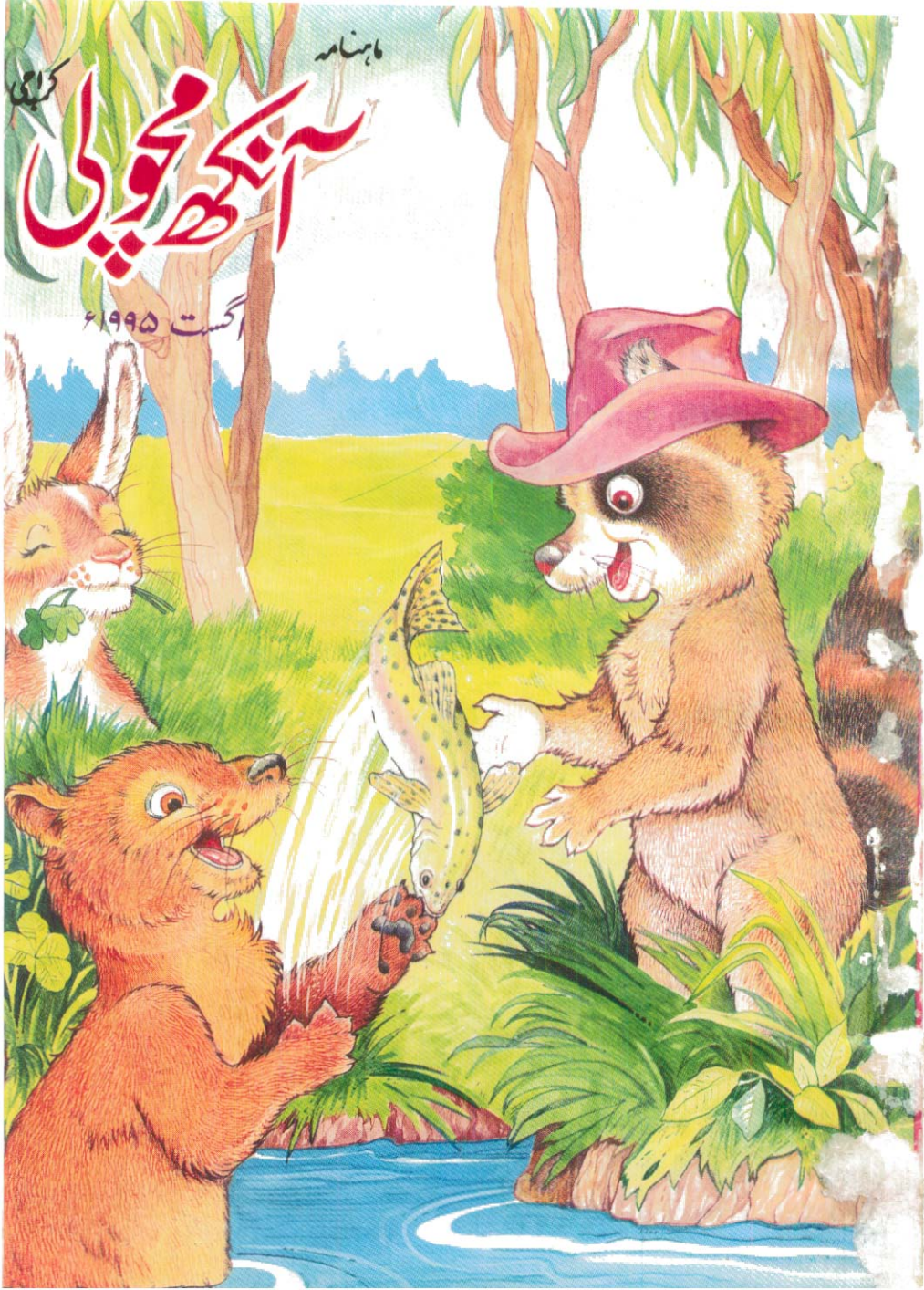

لذّت، صحت اور توانائی!
کوئیس® جام جیلی اور مارملیڈ
QUICE® Pineapple Jelly
QUICE® Orange Marmalade
QUICE® Apple Jam
QUICE® Black Currant Jam
QUICE® Mango Jam
QUICE® Mixed Fruit Jam
QUICE® Apple Jelly
کوئیس
کوئیس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ، حطار
مارکیٹنگ ڈیپارٹمنٹ
4944529 - 4933061

لمحۂ فکریہ

سورۃ فاتحہ

کا مسلمانوں سے سوال

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے
رحمان اور رحیم ہے
روزِ جزا کا مالک ہے
ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور
تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں
دِکھا ہمیں سیدھا راستہ
اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام فرمایا
جو معتوب نہیں ہوئے
جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں

نام اللہ کا اور کام شیطان کے
تعریف اللہ کی، تقلید غیر اللہ کی
رحمان و رحیم وہ، انعام و اکرام کی اُمید کسی اور سے
روزِ جزا کا مالک وہ، خوفِ سزا کسی اور سے
عبادت اس کی، اطاعت غیروں کی
مالک و مددگار وہ، طلب و اعانت دُوسروں سے
راستہ وہ دکھائے، رہبر کوئی اور ٹھہرے
آخر اُن لوگوں میں ہم کیوں شامل کئے جائیں جن پر
انعام ہوا کہ انعام تو فرمانبرداروں کا حق ہے۔
اُن لوگوں میں سے کیوں نہ ہوں جن پہ غضب ہوا
کہ غضب ہی نافرمانوں کا مقدّر ہے۔

عطیہ اشتہار

حاجی فتح محمد میموریل آرگنائزیشن
۷۔ حسن لشکری اسٹریٹ، بادشاہی روڈ کراچی
۸۷۔ بلاک نمبر ۷، خانیوال

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر

پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ

آنکھ مچولی کا ایک اور **خوفناک نمبر**

نومبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہو رہا ہے۔

مگر اس خوفناک نمبر کے لئے آپ بھی تو کچھ لکھئے، مثلاً

- کوئی خوفناک کہانی یا واقعہ،
- کوئی سنسنی خیز نظم یا حادثہ
- دہشت سے متعلق کوئی مضمون
- کوئی دل ہلا دینے والی داستان
- یا کوئی خوفناک تصویر

لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا۔ حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا

جلدی کیجئے

خوفناک نمبر کیلئے بے خوف ہو کر لکھئے آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا۔۔۔۔

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

ربیع الاول، ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ اگست ۱۹۹۵ء

شمارہ ۲

جلد ۱۰

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلسِ ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر: ۳۹۳۲۸۵۷ ۳۹۳۸۲۱۰

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۶ ا-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۱۶ روپے
درہم
ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاھد علی۔ مطبع لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 2577392 - 95 (4 Lines)

جہاں چلے، رواں چلے

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	ادارہ	۸
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۹
حمد باری تعالیٰ (نظم)	ضیغم حمیدی	۱۰
توہینِ رسالت پر سزائے موت کیوں؟	محمد جاوید خالد	۱۱
جوالا مکھی پہاڑ	سیّد مسعود حسن رضوی ادیب	۱۷
پاگل کون	اصغر علی ساگر	۲۰
اے نوجوانانِ وطن (نظم)	محمد شاہد فیروز	۲۶
نظیر اکبر آبادی	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۷
ریس	رابعہ ابراہیم	۳۲
تین نسلوں کا استاد	منیر احمد راشد	۳۹
شادی یا بربادی	محمد بن مالک	۴۷
کولمبس کہاں دفن ہے	عبدالستار خان طاہر	۵۲
بوریوالہ ایکسپریس	سلیم خالق	۵۷
پیار کروں (نظم)	جنید حفیظ	۶۲
سانپ	محمد عادل منہاج	۶۳
ادلے کا بدلہ	فریدہ نذیر	۶۹
چڑیا گھر میں	رخشندہ خالد	۷۴
ایٹم (نظم)	افق دہلوی	۷۶
ایک دفعہ کا ذکر ہے	نعیم مشتاق نومی	۷۸
ہنستے ہنستے	منتخب لطائف	۸۳
اب میں کیا کروں	ادارہ	۸۸
پہلی مہم	فرحان الدین	۹۱
بنام آنکھ مچولی	خطوں کے جواب	۹۵
جنگل کی دنیا (نظم)	شبیر بیگ ناز	۹۸
سوال آدھا جواب آدھا	محمد بن مالک	۱۰۰
کہانی انسان کی	اسحاق منصوری	۱۰۳
قلم دوست	ننھی تحریریں	۱۰۹

سنہرے حروف

حضرت خبیبؓ ایک صحابی رسولؐ تھے جو ایک دفعہ دھوکے سے قید کر لئے گئے۔ قید کرنے والوں نے انہیں مکہ لے جاکر فروخت کر دیا۔ مکہ کا ایک سردار ایک غزوہ میں حضرت خبیبؓ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اعلان کیا کہ وہ (حضرت) خبیبؓ سے سے اپنے باپ کا بدلہ لیں گے اور انہیں بر سر عام اذیت دے دے کر ماریں گے۔

مرنے سے کچھ پہلے حضرت خبیبؓ نے حجامت کے لئے استرا طلب کیا۔ اس دوران میں گھر کا چھوٹا بچہ بے خبری میں ان کے پاس چلا گیا۔ آپؓ نے اسے گود میں اٹھایا' پیار کیا۔ بچے کی ماں نے دیکھا تو سخت بدحواس ہوئی کہ بچہ قیدی کے پاس ہے اور قیدی استرا لئے ہوئے ہے۔ حضرت خبیبؓ نے مسکراتے ہوئے بچے کو ماں کے حوالے کر دیا اور کہا۔ "ڈرو مت اسلام میں دھوکہ نہیں....."

مقررہ دن حضرت خبیبؓ کو موت کی سزا دینے کے لئے کھلے میدان میں لایا گیا۔ جب ان سے آخری خواہش پوچھی گئی تو انہوں نے کہا "نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔" نماز پڑھ چکے تو آپؓ نے فرمایا "میں چاہتا تھا کہ یہ آخری نماز دیر تک پڑھتا رہوں لیکن میں نے اس خیال سے نماز جلدی ختم کر لی کہ تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں۔ حضرت خبیبؓ کا سر قلم کرنے سے پہلے انہیں پھر ایک موقع دیا گیا کہ اب بھی اگر اسلام چھوڑ دیں تو جان بچ سکتی ہے۔" حضرت خبیبؓ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اسلام کی خاطر جان دینا اسلام کے بغیر زندہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔"

پہلی بات

آزادی ایک ایسی نعمت ہے جس کی قدر و قیمت کا احساس صحیح معنوں میں ان ہی کو ہوتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہوں۔ پنجرے میں بند کسی پرندے کو دیکھئے اسے پنجرے میں کونسی چیز میسر نہیں ہے۔ غذا، رہائش، حفاظت۔ سبھی کچھ۔ لیکن اس سب کے باوجود پنجرے کا دروازہ جوں ہی کھلے گا۔ پرندہ پھُر سے اڑجائے گا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ پنجرے سے نکلنے کے بعد اسے اپنی غذا خود تلاش کرنی ہوگی اپنے لئے روزانہ ایک نیا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا اور اسے یہ بھی خوب معلوم ہے کہ وہ اڑتے ہوئے کسی باز کے پنجوں کا بھی نشانہ بن سکتا ہے ---- لیکن آزادی ایک ایسا احساس ہے کہ اس کے لئے وہ سارے خطرات بے دھڑک مول لیتا ہے۔ اب ذرا اسی بات پر غور کیجئے کہ آزادی جب ایک پرندے کے لئے اتنی اہمیت رکھتی ہے تو پھر ایک انسان اور اس سے بڑھ کر ایک قوم کے لئے کتنی زیادہ اہم ہوگی۔ لیکن یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ جب ایک مرتبہ آزادی مل جاتی ہے۔ تو پھر رفتہ رفتہ آزادی کی اہمیت ختم ہونے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب ہم خواہ کچھ بھی کرتے رہیں، ہماری آزادی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ تاثر بہت غلط بلکہ گمراہ کردینے والا ہے۔ آزادی ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت کے لئے ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے۔ خود ہمارے اپنے ملک کی مثال لیجئے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد جب ہم اپنے فرائض سے غافل ہوگئے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے اور جب وطن سے محبت کا جذبہ بھی کمزور ہوگیا تو ایک بیرونی طاقت نے حملہ کر کے ہمارے ملک کے ایک حصے کو علیحدہ کردیا۔ اس وقت جو کچھ بھی ہوا اس میں ہماری اپنی غلطیوں کوتاہی اور حماقتوں کا بہت زیادہ دخل ہے۔

اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اب بھی ہم نے اس واقعے سے سبق نہیں لیا۔ اور آج بھی ہم اسی طرح آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ملک کے سب سے بڑے شہر میں جس طرح قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔ وہ صرف اسی بات کا ثبوت ہے کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو دوسروں کی غلطیاں تو ایک طرف خود اپنی غلطی سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ بھلا بتایئے --- اس طرح بھی کسی قوم نے ترقی کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس طرح بھی کوئی قوم باقی بچی ہے۔

یہ سب کچھ اسی لئے ہو رہا ہے کہ ہم نے آزادی کی نعمت کو نعمت سمجھنا اور اس کی قدر کرنا چھوڑ دیا ہے --- اگر ہمیں اپنی غلامی یاد نہیں رہی، متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مظالم بھول گئے ہیں تو پھر ہمیں وادیٔ کشمیر پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ آج کشمیری مسلمانوں کو وادیٔ کشمیر میں کیا چیز میسر نہیں ہے۔ روٹی، پانی، ہوا، روشنی ان پر کس چیز کی پابندی ہے --- انہیں جو چیز حاصل نہیں ہے وہ آزادی ہی تو ہے جس کے لئے وہ جان مال، عزت آبرو ہر چیز کی قربانی دے رہے ہیں مگر آزادی، آزادی پکار رہے ہیں --- کیا یہ پکار ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔؟

آپ کا دوست طاہر مسعود

حمدِ باری تعالیٰ

ضیغم حمیدی

ہر شے بنائی تونے، سبحان تیری قدرت
دنیا سجائی تونے، سبحان تیری قدرت

یہ بحر و بر ہیں تیرے، شمس و قمر ہیں تیرے
یہ پھول باغ کلیاں شام و سحر ہیں تیرے

تونے زمیں بنائی اور آسماں بنایا
کوہ و شجر بنائے، سارا جہاں بنایا

ہر پھول کے بدن میں خوشبو بسی ہے تیری
بالائے عقل ساری کاریگری ہے تیری

راتوں کو آسماں پر تارے سجائے تونے
انسان کو کرشمے کیا کیا دکھائے تونے

مالک! تو میری سوئی تقدیر کو جگا دے
اپنے کرم سے میری بگڑی کو بھی بنا دے

توہین رسالت پر سزائے موت کیوں؟

محمد جاوید خالد

ماتحت عدالت میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ سارے ملک کی توجہ اس مقدمے کی طرف تھی۔ اور ایک ملک ہی کیا بلکہ ملک کے باہر بھی لوگ اس مقدمے میں دل چسپی لے رہے تھے۔مقدمہ توہین رسالت کا تھا۔ چند عیسائیوں نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ جملے لکھے تھے، جس کے بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ مقدمہ میں شہادتیں پیش ہوئیں، بیانات قلم بند ہوئے، وکیلوں کی بحث

وجرح ہوئی اور پھر عدالت کا فیصلہ سامنے آگیا ملزمان کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ فیصلہ کا اعلا ہونا تھا کہ دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ مسلمانو نے تو اطمینان کا سانس لیا لیکن مغربی ذرائع ابلا نے انسانی حقوق کے نام پر فیصلے کی مذمت شرو کردی۔ ان کے خیال میں یہ فیصلہ نہایت سنگ دلانہ اور ظالمانہ تھا۔ مسلمانوں میں بھی بعض لوگ جو یورپ سے مرعوب رہتے ہیں، دبے د لفظوں میں اعتراض اٹھانے لگے۔ حکومت پر

دباؤ پڑا اور ملزمان کو بڑی عدالت سے بری کرا کے راتوں رات ملک سے باہر روانہ کر دیا گیا۔

یہ واقعہ زیادہ پرانا نہیں۔ اس واقعے کے حوالے سے مغربی اخبارات اور ان کے ریڈیو اور ٹیلی وژن نے توہین رسالت کے قانون کو ظالمانہ قرار دیا کیونکہ ہمارے ملک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے شخص کی سزا موت ہے۔ آیئے ہم اس سوال پر غور کریں کہ توہین رسالت کیا واقعی بہت بڑا جرم ہے؟ اتنا بڑا جرم کہ اس پر موت کی سزا سنا دی جائے ؟

عزت کی حفاظت ضروری ہے

امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں ایک قانون نافذ ہے۔ اس قانون کو ہتک عزت کے قانون (Law of libel) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص باعزت ہے اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی عزت و وقار پر حملہ کرے اور لوگوں میں اسے رسوا اور بدنام کرنے کی کوشش کرے۔ اور جب کسی شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو وہ اس قانون کا سہارا لے کر اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں وہ اخبارات جو باعزت اور مشہور لوگوں کے خلاف خبریں چھاپتے رہتے ہیں ان پر اکثر ہتک عزت کے مقدمات چلتے رہتے ہیں۔ کوئی اخبار جب ایسا مقدمہ ہار جاتا ہے تو اسے ہرجانے میں اس شخص کو بڑی رقم دینی پڑتی ہے جس کے خلاف اس نے خبر یا مضمون شائع کیا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مقدمات کی وجہ سے اب تک اچھے خاصے اخبارات بند ہو چکے ہیں کیونکہ انہیں ہرجانے کی رقم ادا کرنے کی وجہ سے مالی طور پر بہت نقصان اٹھانا پڑ گیا تھا اور پھر اخبار جاری رکھنا ان کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ میں آج تک اس قانون کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ ملک صحافت کی آزادی کے بہت بڑے دعوے دار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر عام آدمیوں کی عزت کی حفاظت اتنی ضروری چیز ہے تو ایک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے ماننے والوں کی تعداد دنیا میں ایک ارب سے زیادہ ہے، ان کی عزت کیوں مغربی ملکوں کی نگاہ میں اہم نہیں۔ ایک شخص کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچے تو صرف ..... اس شخص کو یا اس کے اہل خاندان کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر تو چند افراد نہیں پورے ایک ارب انسانوں کو شدید روحانی اور جذباتی اذیت پہنچتی ہے۔ اور ایسی اذیت کہ وہ اپنے نبی صلعم کی عزت کی حفاظت کے لئے اپنی جان پر کھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

مسلمان "جنونی" کیوں ہیں؟

اپنے نبی صلعم کی عزت کے معاملے میں مسلمان اتنے جذباتی یا مغربی اخبارات کے الفاظ میں اتنے جنونی کیوں ہیں؟ یہ بات امریکہ اور یورپ کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ ان لوگوں نے خود اپنے نبیوں کی عزت نہیں کی۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے انبیاء پر ہر قسم کے الزامات عائد کیے۔ مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ اپنے نبی صلعم سے عشق ان کے عقیدے میں شامل ہے۔ مسلمان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں اتنی محبت نہ ہوجائے کہ اس محبت کے سامنے ان کے لئے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہوجائے اس وقت تک ان کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بھی مسلمانوں کو نبی کریمؐ کا انتہائی ادب اور تعظیم کرنے کا حکم دیا ہے : فرمایا

"اے مومنو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تم کو خبر ہی نہ ہو۔" (سورہ حجرات)

مسلمان اپنے نبی صلعم کے معاملے میں واقعتاً" انتہائی جذباتی واقع ہوئے ہیں لیکن ان کی جذباتیت عقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان کے نبی صلعم کی ذات تقلید کا نمونہ ہے۔ ان کے لئے دین و دنیا کی نجات اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلیں اور جو کچھ ان کے نبیؐ نے کیا تھا وہ بھی وہی کچھ کریں۔ اب اگر مسلمانوں کی امت کے لئے نبیؐ کی ذات کامل نمونہ ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس نمونے (Model) کی حفاظت کی جائے۔ کیونکہ اگر یہ نمونہ ان کے لئے قابل عزت نہ رہے اور ہر نابکار کو اس سے کھیلنے کی اجازت مل جائے تو مسلمانوں کے دین و دنیا دونوں ہی برباد ہوجائیں گے۔ کیونکہ جب نمونہ ہی محفوظ نہ رہا تو وہ تقلید کس کی کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کسی بدبخت نے کیچڑ اچھالی ہے، مسلمانوں نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔ کیونکہ نبی صلعم کے ناموس کی حفاظت درحقیقت دین کی حفاظت ہے۔

یہ سزا ہولناک نہیں ہے!

مغربی اخبارات کو شکایت ہے کہ پاکستان میں توہین رسالت کے لئے موت کی سزا بہت ہولناک

ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں نبی کی توہین کرنا اتنا بڑا جرم نہیں کہ اس پر ایک شخص کو زندگی سے محروم کردیا جائے۔ ابھی ہم نے اوپر ہتک عزت کے قانون کی مثال دی اسی قانون کے حوالے سے یہ بات بتانے کے قابل ہے کہ اس قانون کے تحت جو آدمی جتنا زیادہ مشہور' جتنا زیادہ معاشرے میں عزت و وقار رکھنے والا ہوگا۔ ہرجانے کی رقم اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ مثلاً ایک شخص جس کی شہرت صرف لندن تک محدود ہے اور ایک شخص جس سے پورا برطانیہ واقف ہے' اگر کوئی اخبار ان دونوں اشخاص کے خلاف کوئی بے بنیاد خبر شائع کرے اور دونوں ہی اشخاص عدالت سے رجوع کریں تو جو شخص زیادہ مشہور ہوگا وہ اخبار سے ہرجانے کی زیادہ بڑی رقم طلب کرسکتا ہے۔ خصوصاً" اس شخص کے مقابلے میں جو صرف لندن تک کی شہرت رکھتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہتک عزت کے قانون میں سزا کا تعلق عزت سے وابستہ ہے۔ گویا جس شخص کی عزت کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگا' اس کی عزت سے کھیلنے والے کی سزا بھی اتنی بڑی ہوگی۔ مسلمانوں کے نزدیک چونکہ ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کا معاملہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اِس لئے اس عزت سے کھیلنے والے کی سزا بھی موت سے کم نہیں ہوسکتی۔

دو اور دلیلیں :

مغربی ممالک بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کسی ملک کے سفیر کے ساتھ اگر کوئی بدتمیزی یا بدتہذیبی کی جائے تو یہ اس قوم کے ساتھ بدتہذیبی ہے جس کا وہ سفیر نمائندہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ کا بھیجا ہوا نبی درحقیقت اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کی توہین ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی توہین ہے جس کی کم سے کم سزا موت ہی ہوسکتی ہے۔

توہین رسالت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ نبیؐ کو نہ ماننا اور رسالت پر ایمان نہ لانا ایک فرد کا ایسا فعل ہے جس میں وہ آزاد ہے۔ چاہے وہ نبیؐ کو مانے یا نہ مانے۔ اس پر کم سے کم دنیا میں سزا نہیں ہے لیکن اس شخص کو نبیؐ کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ نبیؐ کی توہین کا صاف مطلب ہے مسلمانوں کے دین اور ان کے عقائد پر حملہ کرنا' جس کی اجازت دنیا کا کوئی قانون دیتا ہے اور نہ اخلاق۔ اور جو کوئی ایسا کرتا ہے اسے سزا کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

ہوش کا لمحہ

تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دور نہ جایئے اسی برصغیر میں ایک گستاخ رسولؐ ہندو نے ایک کتاب لکھی۔ جس میں آپؐ کی

شان میں بے ادبی کی گئی تھی۔ ایک عام سے بڑھئی کا ایک نوجوان بیٹا جو خود کو چوان تھا' تانگا چلاتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہ تھا بس اسے پتہ چلا کہ ایک بدبخت نے ایسا کیا ہے۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ اس کی غیرت ایمانی نے جوش مارا۔ وہ اس شہر میں پہنچا جہاں وہ ہندو رہتا تھا۔ اس کا پتہ کیا اور اسے جہنم رسید کر کے بڑی خوشی کے ساتھ پھانسی کے پھندے تک پہنچ گیا۔ انگریز کی حکومت تھی۔ قانون میں اس بات کی گنجائش نکلی کہ اگر یہ نوجوان (غازی علم الدین شہید رحمتہ اللہ علیہ) یہ اقرار کرلے کہ اس نے جذبات میں آکر یہ قتل کیا ہے اور وہ ایسا کرتے وقت ہوش میں نہیں تھا تو پھانسی سے بچنے کی صورت نکل سکتی ہے۔ غازی علم الدین شہید رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ بات آئی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں یہ کیسے کہہ دوں کہ میں ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے تو ہوش ہی اس لمحے آیا تھا۔"

شاعر مشرق کی حسرت

علامہ اقبال کو جب غازی علم الدین کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے نہایت حسرت سے کہا۔ ایک بڑھئی کا لڑکا ہم سب سے بازی لے گیا' ہم تو دیکھتے ہی رہ گئے۔"

دراصل کوئی بھی مسلمان وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے کیسا ہی کمزور کیوں نہ ہو' اس مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرسکتا خواہ وہ علم الدین جیسا عام سا مسلمان ہو یا علامہ اقبال جیسا مفکر و شاعر مسلمان۔ مقامِ رسولؐ اور شانِ رسولؐ اس کے لئے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے یہی وجہ ہے کہ جب کہیں، جہاں کہیں ایسا واقعہ ہوا نبیؐ کے جان نثاروں نے قانون کے حرکت میں آنے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ وہ خود متحرک ہوگئے اور گستاخ زبانوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں۔

محمدؐ کی غلامی دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

کیا کرنا چاہتے ہو

- نیت کرنا چاہتے ہو تو اعمال صالح کی نیت کرو۔
- عمل کرنا چاہتے ہو تو احکام شریعہ پر عمل کرو۔
- ادا کرنا چاہتے ہو تو نماز پنجگانہ ادا کرو۔
- سننا چاہتے ہو تو قرآن حکیم سنو۔
- رکھنا چاہتے ہو تو ماہ رمضان کے روزے رکھو۔
- جاگنا چاہتے ہو تو شب قدر میں جاگو۔
- سفر کرنا چاہتے ہو تو حجاز مقدس کا سفر کرو۔
- پڑھنا چاہتے ہو تو قرآن پاک پڑھو۔

مرسلہ: ش۔ م۔ شہزاد' کراچی

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

پی۔ او۔ بکس نمبر 1485، فیصل مسجد اسلام آباد

اسکولوں کے طلبہ و طالبات کے لئے

دعوۃ ریڈرز کلب ممبر شپ حاصل کیجئے

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی گذشتہ دس برسوں سے اندرون و بیرون پاکستان دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس کے پروگراموں میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے دعوتی کارکنوں کی تربیت، عصر حاضر کے تقاضوں کی پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا کی مختلف زبانوں اور پاکستان کی علاقائی زبانوں میں آسان، عام فہم اور موثر اسلامی لٹریچر کی تیاری شامل ہے۔ اکیڈمی نے اسکولوں کے طلباء و طالبات کے لئے بھی دلچسپ اور موثر کہانیاں شائع کی ہیں۔

دعوۃ ریڈرز کلب کا ایک جونیئر سیکشن بھی قائم کیا گیا ہے جس میں صرف اسکولوں کے طلباء و طالبات رکن بن سکتے ہیں۔ جن کے لئے ممبر شپ فیس -/10 روپے سالانہ ہے۔ اسکولوں کے طلباء و طالبات ممبر شپ کے کوائف اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر / پرنسپل سے تصدیق کروا کر ارسال کریں۔

ممبر شپ فارم:

نام _____

ولدیت _____

عمر / تاریخ پیدائش _____

سکول _____

کلاس _____ مطالعاتی دلچسپی _____

مشغلہ _____

پتہ برائے خط و کتابت _____

مندرجہ بالا معلومات سادہ کاغذ پر مہیا کر سکتے ہیں۔ ممبر شپ حاصل کرنے کی آخری تاریخ 30 اگست ہے۔ اور یہ ممبر شپ ایک سال کے لئے ہوگی۔

کلب کے ممبران کو سال میں دو کتب بطور تحفہ ارسال کی جاتی ہیں اور ممبر شپ کے عرصہ کے دوران دعوۃ اکیڈمی کی مطبوعات نصف قیمت پر مہیا کی جاتی ہیں جن کی فہرست پہلی کتاب کے ساتھ ممبران کو ارسال کی جائے گی۔

برائے رابطہ:

محمود احمد فاروقی

انچارج دعوۃ ریڈرز کلب

فون: 852835 ، 858640-43

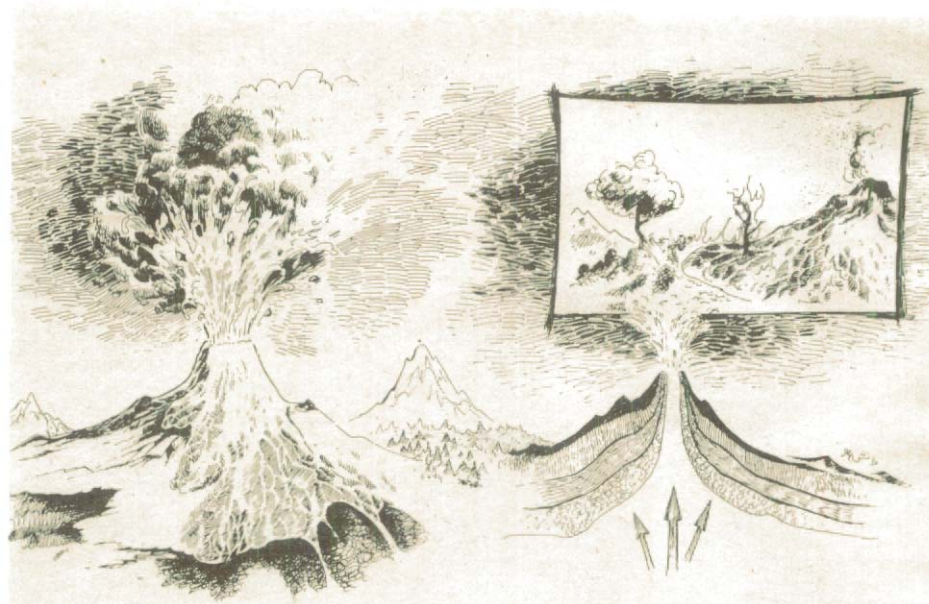

جوالا مکھی پہاڑ

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

دنیا میں کہیں کہیں ایسے پہاڑ بھی ہیں جن کی چوٹی پر ایک بڑا سوراخ یا غار ہوتا ہے اور اس سوراخ سے دھواں، شعلے سنگ ریزے اور پگھلا ہوا پتھر بڑے زور کے ساتھ نکلا کرتا ہے۔ ایسے پہاڑ کو "جوالا مکھی پہاڑ" یا "کوہ آتش فشاں" کہتے ہیں اور اس سوراخ یا غار کو پہاڑ کا دہانہ کہہ سکتے ہیں۔

بعض جوالا مکھی پہاڑوں سے پگھلا ہوا پتھر اس کثرت سے نکلتا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں کالی کالی کیچڑ کا دریا میلوں بہتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی چیز اس دریا میں گر پڑے تو جل بھُن کر خاک ہو جائے۔ یہ پگھلا ہوا پتھر "لاوا" کہلاتا ہے۔ جب لاوا ٹھنڈا ہو کر جم جاتا ہے تو سیاہ رنگ کی پتھریلی چٹانیں بن جاتی ہیں۔

تمہیں تعجب ہو گا کہ پہاڑوں کے اندر آگ کہاں سے آگئی مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین جس پر ہم تم چلتے پھرتے رہتے

ہتے ہیں، اس کے پیٹ میں آگ ہی آگ بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک بڑا گہرا کنواں کھودتا چلا جائے تو بہت دور چل کر وہ ایسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں بے انتہا آگ دہک رہی ہے اور پگھلے ہوئے پتھر یعنی "لاوا" کا ایک بے تھاہ سمندر بھرا ہوا ہے۔

زمین میں کہیں کہیں ایسے غار ہیں جو سیکڑوں میل گہرے ہیں اور زمین کے اندر کی آگ تک پہنچ گئے ہیں۔ انہیں غاروں سے دھواں، شعلے پتھر کے ٹکڑے اور لاوا نکلنے لگتا ہے۔ لاوا اور پتھر کے ٹکڑے غار کے ارد گرد جمع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ بعض بعض دفعہ برسوں جاری رہتا ہے اور لاوا اور پتھر جمع ہوتے ہوتے بڑے بڑے پہاڑ بن جاتے ہیں

کچھ دور اور چڑھو گے تو آبادی ختم ہو جائے گی۔ اور اوپر جاؤ گے تو درخت بھی نہ دکھائی دیں گے، صرف کالا کالا صفاچٹ پہاڑ رہ جائے گا۔ پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ کر ریل ٹھہر جائے گی۔ اگر تم پہاڑ کا دہانہ دیکھنا چاہو گے تو کچھ دور پیدل چلنا پڑے گا۔ دہانے کے قریب پہنچ کر تم دیکھو گے کہ پہاڑ میں سے بے انتہا دھواں نکل رہا ہے۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے لال لال پتھر بھی دھوئیں کے ساتھ نکلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

اب اس پہاڑ سے لاوا نہیں نکلتا۔ مگر جو لاوا پہلے کا جمع ہے وہ کہیں کہیں اب بھی اتنا گرم ہے کہ اگر چٹان کے کسی شگاف میں تم اپنی چھڑی داخل کر دو تو چھڑی میں آگ لگ جائے گی۔

انہیں کو لوگ جوالا مکھی پہاڑ کہنے لگتے ہیں۔

دنیا میں سب سے بڑا جوالا مکھی اٹلی کے ملک میں ہے۔ "وسو ویس" اس کا نام ہے۔ اس پہاڑی پر ریل بھی گئی ہے۔ بہت سے لوگ اسے دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ اگر تم بھی ریل پر سوار ہو کر اس پہاڑ کی سیر کے لئے جاؤ تو دیکھو گے کہ پہاڑ کا دامن یعنی اس کے نیچے کا حصہ بہت سرسبز ہے۔ طرح طرح کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ غلہ بھی وہاں خوب پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنے مکان وہیں بنا لئے ہیں ان لوگوں کا دل بڑا مضبوط ہے کہ ایسے خوف کے مقام میں خوشی خوشی رہتے ہیں اور پہاڑی کی چوٹی پر جو آگ برس رہی ہے اس سے ذرا نہیں ڈرتے۔

اعتذار

جولائی ۹۵ء کے شمارے میں عبدالباسط مرحوم کی نظم کے ایک مصرع میں ایک لفظ ایسا استعمال ہو گیا تھا جس سے ہمارے ملک میں بسنے والے ہندو بھائیوں کی دل آزاری ہو سکتی ہے۔ اس لئے ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے۔ اسی طرح ایک موٹے آدمی کی تصویر پر "موٹا آلو پلپلا" کا کیپشن چھپ گیا تھا ایسا کہنا اور لکھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ادارے کو اس غلطی پر بھی افسوس ہے۔ (ادارہ)

چڑیا گھر میں شیر بھی چڑیا

تارا، میری ہیپی ہیپی

رخشندہ خالد

جوں ہی اس کی آنکھ کھلتی ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ گرم اور خوشگوار فضا میں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ جنگل کی نہیں، نرسری کی فضا ہے، جہاں اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک نہایت مہربان اور شفیق خاتون مقرر ہے جس کا نام میری ہے۔ میری نے خود اس کا نام تارا رکھ دیا ہے۔ تارا کا تعلق رائل بنگال ٹائیگر کی نسل سے ہے۔ شیروں کی یہ نسل مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کے

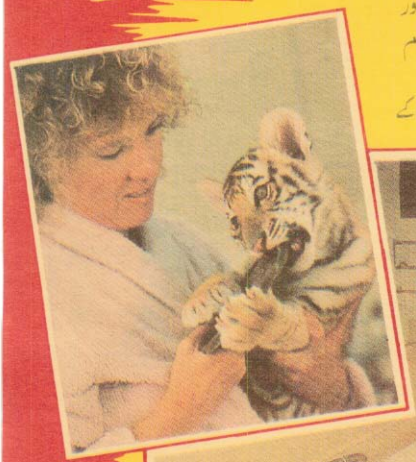

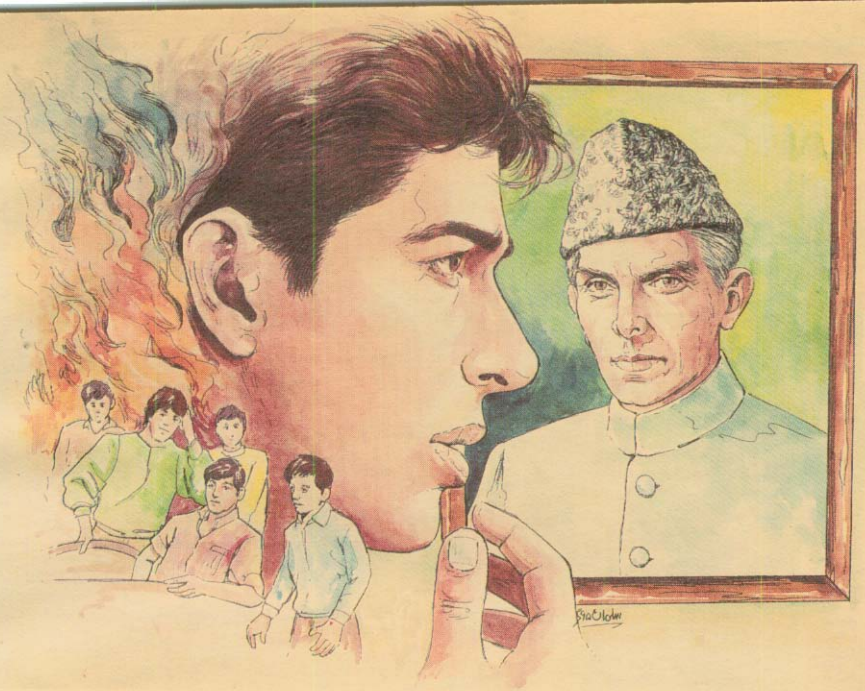

پاگل کون؟

اصغر علی ساگر

مرکزی کردار

عادل : ایک سچا پاکستانی نوجوان، جو انٹر کا طالب علم ہے۔ **احسان صاحب :** عادل کے والد **وسیم :** عادل کا بڑا بھائی، جو ایک سرکاری آفیسر ہے **کامران :** عادل کا پڑوسی دوست، جو اس کا کلاس فیلو بھی ہے۔ **رضوان :** عادل کا کلاس فیلو۔ اور کئی دوسرے۔

پہلا منظر

شہر کے معروف کالج کے پرنسپل کا دفتر، جہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ پرنسپل صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے فائل دیکھ رہے ہیں۔ عادل دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت مانگتا ہے۔ پرنسپل صاحب کا "یس" سن کر وہ

مؤدب ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

پرنسپل صاحب (فائل ایک طرف رکھتے ہوئے) : "دیکھو عادل! میں مانتا ہوں کہ تم بہت ذہین ہو۔ تم نے اب تک ہر کلاس میں ٹاپ کیا ہے۔ مگر تم کچھ عرصے سے اپنی ذہانت کا ناجائز استعمال کر رہے ہو۔"

عادل (حیرانگی سے) : "سر! میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔"

پرنسپل صاحب : "بات دراصل یہ ہے کہ اب تک تمہارے تین ٹیچرز مجھے یہ شکایت کر چکے ہیں کہ تم کلاس کے دوران سوالات پوچھ کر انہیں تنگ کرتے ہو۔۔۔۔؟"

عادل : "سر! میں سوالات اپنے کورس میں سے ہی کرتا ہوں۔۔۔۔ اور وہ بھی سبق کے اختتام پر پوچھتا ہوں۔۔۔ میرا مقصد انہیں تنگ کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو سمجھانا ہے۔"

پرنسپل صاحب : "میں نے کب کہا ہے کہ تم آوٹ آف کورس سوال کرتے ہو۔۔۔ لیکن تم آخر سوال کر کے ٹیچرز کو کیوں تنگ کرتے ہو؟"

عادل (التجائی انداز میں) : "میں سچ کہہ رہا ہوں سر!۔۔۔۔ میں تو ٹیچرز کو تنگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔۔ بس صرف اپنے سمجھنے کی خاطر سوال۔۔۔۔"

پرنسپل صاحب (غصہ ہو کر) : "میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم یہ سوال کرتے کیوں ہو، جو تمہارے ٹیچرز کو اچھے نہیں لگتے!"

عادل (ہمت کر کے) : "سر! میں سوال نہیں پوچھوں گا تو علم کیسے حاصل کروں گا؟"

پرنسپل صاحب (بھڑکتے ہوئے) : "جیسے اور اسٹوڈنٹس حاصل کرتے ہیں!"

عادل (حوصلہ کرتے ہوئے) : "لیکن سر! کیا میں بحیثیت طالب علم سوال پوچھنے کا حق نہیں رکھتا؟"

پرنسپل صاحب : (سمجھانے کے انداز میں) "یقیناً تم اس کا حق رکھتے ہو۔ اور اچھے طالب علم سوال کیا کرتے ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہر سوال کلاس ہی میں کیا کرو۔ دیکھو نا اس طرح کورس پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ پوچھنا ہی ہے تو اسٹاف روم میں جا کر پوچھ لیا کرو کلاس کو ڈسٹرب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

عادل : (کسمسا کر) "مگر سر اسٹاف روم میں اتنے لوگ ہوتے ہیں کہ۔۔۔۔"

پرنسپل صاحب (چڑ کر) "تو اب میں صرف تمہارے سوال پوچھنے کے لئے ایک الگ کمرے کا انتظام تو نہیں کر سکتا نا۔۔۔۔ بس میں نے جو کہہ دیا ہے اس کا خیال رکھنا۔ آئندہ شکایت نہ ملے۔ اب تم

جاسکتے ہو۔"

پرنسپل صاحب دوبارہ فائل دیکھنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ عادل بھیگی آنکھوں سے سامنے کی دیوار پر لگی قائداعظم کی تصویر پر آخری نظر ڈالتا ہے اور پھر مڑ کر بوجھل قدموں سے باہر نکل جاتا ہے۔

دوسرا منظر

محلے کے سرے پر واقع کامران کے جنرل اسٹور کا منظر، جہاں کامران شام کے وقت بیٹھتا ہے۔ کاؤنٹر کے پیچھے تینوں ہم جماعت دوست کامران، رضوان، اور عادل باتوں میں مصروف ہیں۔

کامران (اچانک کچھ یاد آتے ہوئے) : "اوہ یار! ایک بڑی زبردست خوشخبری بتانا تو میں بھول ہی گیا---

آج رات کے میوزیکل کنسرٹ کے لئے ہم تینوں کے ٹکٹ آگئے۔ میرا کزن ابھی دے کے گیا ہے!"

رضوان (خوشی سے اچھل کر) : "اوجیئو کامی! آج رات کو تو اپنے مزے ہونگے---ویسے یار! کوگیدرنگ (CO-Gathering) والی بات تو درست ہے نا؟"

کامران : "ہاں بھئی! سو فیصد درست ہے اس کے بغیر کنسرٹ ہی بے کار ہے۔"

اس بات پر کامران اور رضوان قہقہہ لگاتے ہیں جبکہ عادل کے چہرے پر ناگواری کے آثار بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

عادل (بیزاری سے) : "یار رضوان! کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بعد میوزیکل کنسرٹ کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ روزانہ تیس بتیس آدمی مر رہے ہیں۔"

کامران (حیرت سے) : "کیا مطلب!---کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے؟"

عادل : "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں شاید تم نے اسے نہیں سنا۔ میں کراچی کے ہنگاموں---"

رضوان (بات کاٹ کر) : "چھوڑو یار! تم کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ ہنگامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور لوگ بھی مرتے رہتے ہیں اور ویسے بھی زندگی تو نام ہی ہنگامے کا ہے---"

عادل : (سنجیدہ لہجے میں) : "یار رضوان! اتنے بے حس تو نہ بنو۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ ایک طرف گولیاں چل رہی ہوں اور لاشیں گر رہی ہوں اور دوسری طرف ہم میوزیکل کنسرٹ میں شریک

ہوں۔ ذرا سوچو تو سہی۔"

کامران (منہ پھیر کر) : "عادل! ایک تو تم ہر بات میں --- کوئی نہ کوئی فلسفہ لے کر بیٹھ جاتے ہو!"

عادل (پُرسکون لہجے میں) : "یہ فلسفہ تو نہیں ہے کامران، یہ تو حقائق ہیں، بالکل سامنے کے۔ پتا نہیں تم لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔

رضوان : "(کامران سے) چھوڑو بھی۔ تم بھی کس سے الجھ گئے۔ جسے میوزیکل کنسرٹ میں نہ جانا ہو نہ جائے۔ کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔

عادل (اٹھتے ہوئے) : --- "ہاں بھئی --- میں تو نہیں جا سکتا۔ میرا کام صحیح بات بتانا تھا سو بتادی۔ اب تم لوگ اپنی مرضی کے مالک ہو۔"

کامران (ہاتھ جوڑ کر) : "ہاں بابا۔ اس ملک میں اب تم ہی ایک محب وطن رہ گئے ہو۔ باقی ہم سب تو غدار ہیں، دشمن ہیں، بے حس ہیں۔ ہیں نا؟"

عادل (افسردگی سے) : "میں نے یہ کب کہا ہے۔ میری باتوں کو غلط مفہوم تو نہ پہناؤ۔ سچ کہا ہے کسی نے اٹھایا اسے جاتا ہے جو سو رہا ہو۔ جاگتے ہوئے کو کون جگا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اسٹور سے نکل جاتا ہے۔ کامران اور رضوان ایک دوسرے کو دیکھ کر زیر لب طنزاً مسکرا دیتے ہیں۔

نمک حلال

قائد اعظم کے عزیز دوست ملک برکت علی ایڈووکیٹ کے ہاں شادی کی تقریب تھی جس میں قائد اعظم بھی مدعو کیے گئے تھے کھانے کی میز پر فرنی رکھی گئی جس میں غلطی سے چینی کی بجائے نمک شامل کر دیا گیا تھا جب مہمانوں نے نمکین فرنی کے بھرے ہوئے چمچ منہ میں ڈالے تو گلے منہ بسورنے۔ چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں صاحب خانہ کے لئے بڑا ہی نازک وقت تھا تب قائد اعظم محمد علی جناح میزبان ملک برکت علی کے آڑے آئے اور انھوں نے مہمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا

"حضرات! نمکین فرنی پر متعجب نہ ہوں ملک برکت علی آپ کو اپنے گھر کا زیادہ سے زیادہ نمک کھلانے چاہتے ہیں تاکہ ان کا نمک حلال کر سکیں۔"

محفل کشت زعفران ہو گئی اور میزبان بے چارے کی جان میں جان آئی

مرسلہ ..... خرم نذر وڑائچ، لاہور

تیسرا منظر

عادل کا کمرہ۔ عادل اپنے اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ کھڑا اخبار پڑھ رہا ہے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور عادل کے والد احسان صاحب اور بڑے بھائی وسیم اندر داخل

ہوتے ہیں۔ عادل ان کو دیکھتے ہی فوراً" اخبار ایک طرف رکھ دیتا ہے اور انہیں سلام کرتا ہے، لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی سلام کا جواب نہیں دیتا۔ دونوں کے چہروں پر غصے کے آثار نمایاں ہیں۔

وسیم (کرخت لہجے میں) : "بابا! پوچھیے اس باضمیر صاحب زادے سے کہ اس نے کیوں میری بھیجی ہوئی گاڑی کو واپس بھیج دیا---اوپر سے ڈرائیور کے ساتھ وہ بدتمیزی کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔"

احسان صاحب (عادل پر نظریں جمائے) : "خاموش کیوں ہو! جواب دو!--- کس کی اجازت سے تم نے یہ سب کچھ کیا؟"

عادل (مودبانہ لہجے میں) : "بابا! وہ سرکاری گاڑی تھی اور سرکاری گاڑی کو گھر کے کام کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیے---- میں نے اسی خیال سے گاڑی واپس بھیجی --- اور ڈرائیور سے تو میں نے صرف اتنا کہا کہ بحیثیت سرکاری ملازم اسے افسروں کے نجی کام کے لئے گاڑی استعمال کرنے سے بچنا چاہئے۔"

احسان صاحب (ہونٹ بھینچتے ہوئے) : "تم بڑے آئے ہو لوگوں کو فرض سکھانے والے!-- - کیا تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ آج گاڑی نہ ہونے کے باعث ہم کمال صاحب کے ہاں تقریب میں شرکت نہ کر سکے۔"

عادل (آنکھیں جھکائے ہوئے) : "بابا! میں نے تو ایک اصول کی بات کی تھی۔"

وسیم (طنز سے) : "اصول تو بس تمہیں ہی آتے ہیں.... باقی ہم سب لوگ تو بے اصولے ہیں۔ عادل! تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟"

احسان صاحب : "عادل! اگر تمہاری یہی سوچ رہی تو تم کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکتے----- آخر تم اکیلے کیا کر سکتے ہو!----"

عادل (سر جھکا کر) : "بابا! مجھے معلوم ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ لیکن میں ایسا اس لئے کرتا ہوں کیونکہ مجھے ایسا کر کے خوشی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے ایک ٹھیک کام کیا۔ بابا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔ سیدھے راستے پر ہوں یا نہیں۔"

احسان صاحب (بیزاری سے) : "یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ مانتا ہوں، لیکن بیٹے ان باتوں کا حقیقت کی دنیا سے کیا تعلق۔ ابھی تمہیں دنیا کا نہیں پتا۔ میں کہتا ہوں دنیا کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ سیکھو ورنہ صرف انہی کتابی اصولوں کے ہو کر رہ جاؤ گے!"

عادل : "لیکن بابا! یہ دنیا کون بناتا ہے۔ اس دنیا میں کون لوگ رہتے ہیں۔ ہم اور آپ ہی رہتے ہیں نا۔ اگر ہم اور آپ ٹھیک ہونا چاہیں تو ہمیں ٹھیک ہونے سے کون روک سکتا ہے؟"

وسیم (احسان صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) : "چھوڑیئے بابا! یہ تو پاگل ہے۔۔۔ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔۔۔ چلیے باہر چلتے ہیں۔"

احسان صاحب عادل پر نظر ڈالتے ہوئے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ پھر رک کر اسے دیکھتے ہیں اور سر جھٹک کر چلے جاتے ہیں۔

عادل انتہائی بے قراری کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اچانک اس کی نظر اپنے اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ والی دیوار پر نصب قائداعظم کی تصویر پر پڑتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر قائداعظم کی تصویر کے عین سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور تصویر کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے پوچھ رہا ہو، "قائداعظم میں نے ٹھیک کہا نا۔۔۔۔"

تب اسے ایسا لگتا ہے جیسے قائداعظم کی تصویر مسکرا رہی ہو۔ ایک فخریہ مسکراہٹ، یہ کہتی ہوئی! "جب تم جیسے نوجوان ہوں تو مجھے پاکستان کے مستقبل کے طرف سے کیا تشویش ہو سکتی ہے۔"

مفرّح و مقوّی قلب ہے

معدہ اور دماغ کو

طاقت بخشتا ہے

احمد کا

مُربّہ گاجر

بینائی میں طاقت

ذائقہ اور غذائیت

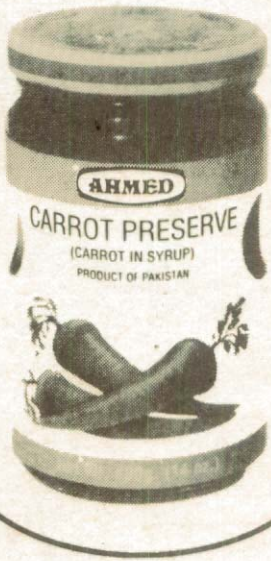

اے نوجوانانِ وطن

محمد شاہد فیروز

اے نوجوانان وطن
اے باغبانان چمن
تم سے وطن کی آن ہے
تم سے چمن کی شان ہے
تم سے ہیں ساری رونقیں
تم سے ہی پاکستان ہے

تم ہو محافظ دیس کے
گبھرو جواں اور شیر سے
تم سے دہل جائے جہاں
قدرت ہے تم پر مہرباں
تم ہو اجالوں کے امیں
تم ہو وطن کے پاسباں

تم خواب کی تعبیر ہو
تم دیس کی تقدیر ہو
محنت سے شرماتے نہیں
مشکل سے گھبراتے نہیں
ہمت کی تم تصویر ہو
تم سچ سے کتراتے نہیں

تم.. قوم کی پہچان ہو
تم روح پاکستان ہو
اے نوجوانان وطن
اے باغبانان چمن

اردو کا عوامی شاعر

نظیر اکبر آبادی

ڈاکٹر اسلم فرخی

بھیڑ دیکھ کر بچے اسی طرف بڑھے۔ کچھ گانے کی آواز بھی آرہی تھی، ایک آدمی نے کہا دیکھ لو دیکھ لو ریچھ کا تماشہ ہو رہا ہے۔ بچوں نے اندر گھس کر دیکھا تو واقعی ریچھ کا تماشہ ہو رہا تھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں لوہے کے بہت سے کڑے پہنے انہیں ڈنڈے سے بجا بجا کر گا رہا تھا

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچا
لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچا
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچا
جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچا
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچا

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا
للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتھاڑا
گہہ ہم نے پچھاڑا اسے گہہ اس نے پچھاڑا
اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گر ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچا

گانے والا کڑے ڈنڈا بجا بجا کر یہ شعر گاتا رہا ادھر ریچھ والے اور ریچھ میں کشتی ہونے لگی۔ کسی نے کہا، "واہ میاں نظیر۔ واہ۔ کیا مزے کے شعر لکھ دیئے ہیں بالکل بچے اور بچے بوڑھے سب کے لئے۔

میاں نظیر اکبر آبادی ایسے ہی شاعر تھے۔

ب کے لئے لکھتے۔ بڑے مزے کے شعر لکھتے تھے۔ کبھی ریچھ کے بچے پر شعر لکھے۔ کبھی ژدہے کے بچے پر شعر لکھے۔ کبھی بئے پر شعر لکھے۔ بیا ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے۔ مگر کمال کا گھر بناتا ہے۔ روشنی کے لئے جگنو پکڑ لاتا ہے اور اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ کبھی کبوتروں پر نظم لکھ دی۔ کبھی بلبلوں کی لڑائی کا سماں دکھایا۔ کچھ گلہری کے بچے کی تصویر دکھائی۔ شاعری کا ہے کو ہے خاصہ تماشا ہے۔ پڑھے جاؤ مزے لئے جاؤ۔

نظیر اکبر آبادی بڑے شاعر تھے اور اپنے رنگ کے اکیلے شاعر تھے۔ کسی اور شاعر نے ان کی طرح شعر نہیں لکھے۔ جو چیز نظر پڑی جو تماشا دکھائی دیا۔ میلے ٹھیلے، تیوہار، تقریبیں ان کی شاعری میں سب کچھ ہے۔ شب برات، عید، جاڑا، گرمی، برسات، تل کے لڈو، ککڑیاں، تربوز، پنکھا، اندھیری رات، آندھی۔ شاعری کا ہے کو ہے خاصہ عجائب خانہ ہے۔ عام بول چال کی زبان ہے۔ جیسے ہم سب لوگ باتیں کرتے ہیں۔ سارے شعر آسانی سے سمجھ میں آتے ہیں۔ سمجھ دار لوگوں کے لئے گہرے بھی ہوتے ہیں۔ عام پڑھنے والوں کے لئے عام باتیں ہیں۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے میاں نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کہتے ہیں۔ عوامی شاعر یعنی ایسا شاعر جس کی شاعری عوام سے تعلق رکھتی ہو۔ پوری اردو شاعری میں میاں نظیر اکبر آبادی کی طرح کا عوامی شاعر کوئی اور نہیں ہے۔

نظیر اکبر آبادی مشہور تاریخی شہر اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ اس شہر کو آگرہ بھی کہتے ہیں۔ آگرہ دو چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے ایک تاج محل، دوسرے نظیر اکبر آبادی۔ نظیر ایک سیدھے سادے معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ لڑکے پڑھاتے تھے۔ ساری زندگی مکتب میں پڑھاتے رہے۔ چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ رنگ سانولا تھا۔ ماتھے پر ایک تل تھا جو دور سے مسا معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، چمک دار آنکھیں، گھوڑی پر بیٹھ کر مکتب جاتے تھے۔ راستے میں ٹھہرتے جاتے۔ کسی نے کہا "میاں فلاں چیز پر نظم لکھ دیجئے۔ ہم گا بجا کر کھائیں کمائیں گے۔" میاں نے گھوڑی روکی۔ نظم لکھ دی اور آگے بڑھ گئے۔ اس طرح نجانے کتنی نظمیں لکھ دیں۔ آگرے میں تاج محل کے قریب ایک محلّہ ہے 'تاج گنج' وہیں ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے مگر شہر بھر میں بڑی عزت تھی۔ سارا شہر ان کے شاگردوں سے بھرا ہوا تھا۔ میاں نظیر قناعت پسند انسان تھے۔ روپے پیسے اور دولت کی ہوس نہیں تھی۔ معمولی آمدنی میں خوش رہتے تھے۔ مشہور ہے کہ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ نے انہیں بلایا۔ ایک آدمی بھیجا کہ جاکر

انہیں لے آئے۔ وہ آدمی آیا سفر خرچ کے لئے روپے دیئے میاں نظیر نے وہ روپے لے جا کر گھر میں رکھ دیئے مگر رات بھر پریشانی میں گزری نیند نہیں آئی صبح ہوئی تو کہنے لگے۔ معمولی سے تعلق کی وجہ سے اتنی پریشانی ہوئی۔ جب پورا تعلق ہوگا تو خدا معلوم کتنی پریشانی ہوگی؟ یہ کہہ کر روپے واپس کردیئے اور جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اگرچہ یہ واقعہ بہت مشہور ہے مگر بہت سے عالم اسے صحیح نہیں سمجھتے اس طرح واقعے خوامخواہ مشہور ہو جاتے ہیں۔

اصلیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف اتنا ہے کہ اس قسم کے واقعوں سے آدمی کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ میاں نظیر کے بارے میں اور بھی بہت سے واقعے مشہور ہوگئے ہیں۔ کہانیاں بن گئی ہیں مگر حقیقت کچھ بھی نہیں۔

میاں نظیر تماشا دکھانے والے شاعر بھی تھے۔ کھری بات کہنے والے شاعر بھی تھے اور دنیا کی حقیقت کو بھی سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہے اسے دیکھو۔ اس سے لطف اٹھاؤ۔ مگر اسے اپنی زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔ کیونکہ دنیا کی کوئی چیز باقی رہنے والی نہیں ہے باقی رہنے والا صرف اللہ کا نام ہے۔

آغاز کسی شے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

میاں نظیر نے دنیا خوب دیکھی اس سے بڑا لطف اٹھایا اور اپنے سارے پڑھنے والوں کو اس لطف میں شریک بھی کرلیا۔ ذرا برسات کی بہاریں دیکھئے کیا مزے آرہے ہیں۔

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہی پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس نظم میں پھسل کر گرنے کا نقشہ بھی ہے۔ کپڑے خراب ہونے کی تصویر بھی ہے۔ میاں نظیر نے کوئی پہلو چھوڑا نہیں۔ جاڑے اور گرمی پر بھی اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ ایک بڑی مشہور نظم ہے "ہنس نامہ"

آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ صحرا کے کیا اس نے گزارا

جنگل کے سارے پرندے اس کے دوست ہوگئے۔ اسے چاہنے لگے۔ بڑا اچھا وقت گزرا۔ پھر ایک دن ہنس نے کہا۔ اب ہم اپنے وطن جائیں گے۔ یہ سن کر سارے پرندے بہت اداس ہوئے۔ اسے روکنے لگے مگر ہنس کسی کے روکے نہیں رکا۔ صبح ہوتے ہی روانہ ہوگیا۔ جنگل کے بہت سے پرندے اس کے ساتھ ہولئے مگر زیادہ

دور تک ساتھ نہ چل سکے اور "آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا" نظیر نے اس نظم کے ذریعے سے صاف سمجھا دیا ہے کہ یار دوست، عزیز، پیارے کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر ہر انسان اور دنیا میں بسنے والے ہر جان دار کو آخر میں اکیلے ہی جانا پڑتا ہے۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

دنیا میں آدمی کے ہزار روپ ہیں۔ بادشاہ بھی ہے فقیر بھی ہے نیک بھی ہے بد بھی ہے چور اور ڈاکو بھی ہے۔ انہیں پکڑنے والا بھی ہے یہ بات ہم سب جانتے ہیں مگر بیان صرف میاں نظیر نے کیا ہے۔ اور اس طرح بیان کی ہے کہ بالکل نئی اور انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواہ
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

عام شاعر لفظوں کے استعمال میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ غلط بولے جاتے ہیں مثلاً تخت اور گرم کہتے ہیں مگر شعر میں تخت اور گرم نظم کرتے ہیں۔ شعر میں صحیح تلفظ کا خیال رکھا جاتا ہے مگر میاں نظیر نے یہ خیال نہیں رکھا۔ انہوں نے لفظوں کو عوامی تلفظ کے مطابق استعمال کیا ہے اس وجہ سے پرانے شاعر انہیں بڑا شاعر نہیں مانتے تھے مگر آہستہ آہستہ نظیر کی بڑائی کے سب قائل ہوگئے۔ نظیر نے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اپنی شاعری میں بہت زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہر فن کے لفظ، ہر علم کے لفظ، ہر موقعے کے لفظ ان کی شاعری میں بڑی تیزی، بڑے تماشے، شوخ اور خوش نما رنگ اور زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں ہیں۔ ایسی تصویریں اور اتنی تصویریں اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتیں نہ اتنے لفظ ملتے ہیں نہ اتنی تصویریں ملتی ہیں۔ نظیر کی شاعری کا ہے کو ہے ایک میلہ ہے جس میں ہر طرف بھیڑ بھاڑ۔ کھیل تماشے، ہنڈولے، چرخ، جانوروں کی بھاگ دوڑ، پرندوں کی اڑان، کھانے پینے کی چیزیں، موسموں کے تحفے، سبھی کچھ ہے۔ اور ان کی شاعری میں روانی بھی بہت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ پڑھو تو معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نغمہ ہے، بڑا خوشنما اور دل موہ لینے والا۔ ان کی ایک نظم ہے "بنجارا نامہ"

اردو کی بڑی نظم سمجھی جاتی ہے.... اس کے الفاظ، روانی اور تیزی دیکھئے۔

نک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونی پلّا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

"جب لاد چلے گا بنجارا" کے الفاظ ہماری زبان میں مثل بن گئی ہیں۔ یہ پوری نظم ایسی ہے کہ پڑھے جائیں اور مزے لئے جائیں۔ سارے دھن دولت، ٹھاٹ باٹھ، رشتوں، ناتوں کا بیان ہے۔ اور یہ بیان بھی کہ یہاں کا سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ بہت بڑا سبق ہے۔ دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ میاں نظیر نے ساری زندگی ایسی ہی رنگ برنگی نظمیں لکھیں۔ بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ اس رنگ برنگے بڑے شاعر نے اگست ۱۸۳۰ء میں دنیا چھوڑ دی مگر دنیا نے اسے نہیں چھوڑا۔ اس کی نظمیں آج بھی جگہ جگہ پڑھی جاتی ہیں۔ ہمیشہ پڑھی جاتی رہیں گی۔

ہوا یوں کہ

ہر انسان کی زندگی مختلف نوعیت کے واقعات سے بھری ہوتی ہے۔ کچھ واقعات خوشی بخشنے والے ہوتے ہیں کچھ دکھ دینے والے، کچھ حیران کن ہیں کچھ مضحکہ خیز۔ یقیناً آپ کے زندگی میں بھی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہوگا جب آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائے ہوں گے یا غم سے آنسو نکل پڑے ہوں گے۔ کوئی ایسا واقعہ جب حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں یا خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں یا ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں اگر ایسا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہو تو ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اسے آنکھ مچولی میں آپ کے نام اور تصویر کے ساتھ شائع کر دیں گے۔ لیکن دھیان رہے کہ واقعہ آپ کا ذاتی اور بالکل سچا ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ دو فل اسکیپ صفحات تک طویل ہو۔ بہترین واقعہ بھیجنے والے کو خوب صورت تحفہ بھی ارسال کیا جائے گا۔

پتا: انچارج مقابلہ ہوا یوں کہ ... ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی

تحریر : بُرین گلُبن
ترجمہ : رابعہ ابراھیم

ریس

ریس شروع ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اور فرگس اصل میدان سے ہٹ کر جھاڑیوں کے قریب جوگنگ کر رہا تھا، مگر اس کے جسم کو گرمانے میں کچھ زیادہ مدد نہیں مل رہی تھی کیونکہ اس کی کھلاڑیوں والی بنیان گھسی پٹی اور شوز معمولی اور جسم کے کھلے حصوں پر تو ہوا کے تھپیڑے کچھ زیادہ ہی تکلیف دے رہے تھے۔ وہ اس وقت سب سے الگ تھلگ اور بالکل خاموش تھا حتیٰ کہ وہ ان لڑکوں کے قریب بھی نہیں گیا جو اس کے اپنے کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ریس خاصے طویل فاصلے پر محیط تھی اس لئے فرگس ازسرِنو ذہن میں نقشہ جما رہا تھا کہ وہ کس مرحلے پر اپنی حکمت عملی کیا رکھے گا۔

"فرگس..... میری جان......." کسی نے کھردری آواز میں پکارا اس نے چونک کر دیکھا وہ

میڈل ٹیگ تھا جو باڑھ کے دوسری طرف بانہیں پھیلائے کھڑا پُر اشتیاق انداز میں ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس کے ڈھانچہ نما جسم پر پھٹے پرانے کپڑے جھول رہے تھے۔ اس کا نام تو ٹیگ تھا لیکن اس کے ساتھ "میڈل" یعنی تمغے کا اضافہ کردیا گیا تھا اور اس کے پیچھے ایک کہانی تھی۔

"فرگس" میرے بچے تم اس وقت کیا محسوس کررہے ہو۔" وہ باڑھ کے عقب سے چیخا تمہاری رگوں میں لہو خوب گرم ہے ناں..... تمہیں تو معلوم ہے کہ انسان جسم کی نہیں دل کی طاقت سے ریس جیتتا ہے۔"

چند لمحے وہ اسی طرح چیخ چیخ کر بولتا رہا پھر خاردار باڑھ عبور کرکے فرگس کے قریب آگیا۔

"خدا کے لئے.....! فرگس گھٹی گھٹی آواز میں چیخا۔ آج تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو' آج میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" پھر اس نے خوفزدہ انداز میں گردن ذرا گھما کر دیکھا وہ لڑکے یقیناً" ٹیگ کو اس کے ساتھ کھڑے اور باتیں کرتے دیکھ چکے تھے اور فرگس کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ سب زہریلے انداز میں تمسخر اڑانے کی تیاریاں کررہے ہوں گے وہ دیوانے میڈل ٹیگ کو ازراہِ تمسخر فرگس کا کوچ اور استاد کہا کرتے تھے۔

"تم کچھ سننا نہیں چاہتے مگر میں تو تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ریس کس طرح جیتی جاتی ہے۔"

"میں پچھلی رات جو کچھ سن چکا ہوں کیا اس کے بعد بھی بتانے کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے۔" فرگس بدستور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔"

"پچھلی رات.....؟ ٹیگ کی دھندلائی ہوئی آنکھیں کچھ اور دھندلا گئیں مگر پھر جیسے کچھ یاد آیا اور وہ سرگوشی میں بولا" مگر تم نے وہ ..... میرے تمغے والی بات پر یقین تو کرلیا تھا نا؟"

فرگس نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اسی دوران کالج کے دو لڑکے جوگنگ کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزرے وہ قیمتی ٹریک سوٹ اور شوز پہنے ہوئے تھے۔ دونوں نے تمسخرانہ انداز میں ذرا آگے جاکر قہقہہ لگایا اور نیچی آواز میں ایک دوسرے سے بات کرنے لگے۔ فرگس کو معلوم تھا کہ ان میں سے ایک لڑکے نے دوسرے کو بتایا ہوگا "اس پاگل کو فرگس کا کوچ کہا جاتا ہے۔"

غصہ کے مارے اس کا جی چاہا کہ زمین میں دھنس جائے مگر ایسا نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اس نے اپنا غصہ ٹیگ پر اتارا اور ایک بار پھر اس سے کرخت لہجے میں کہا" جاؤ دفع ہوجاؤ۔" لیکن جب ٹیگ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ ٹیگ کو

احمقوں کی طرح وہیں کھڑا چھوڑ کر دوڑتا ہوا آگے چلا گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میدان کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔

ٹیگ سے اس کی ملاقات اس وقت ہوئی جس اس نے ایتھلیٹکس کلب میں رکنیت حاصل کی تھی وہ ایک چھوٹا تھا سا کلب تھا لیکن بڑے مقابلوں کا اہتمام کرتا تھا۔ ایک روز وہ کمرے میں تنہا بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اِس نے گھوم کر دیکھا کہ ایک غلیظ اور مفلوک الحال شخص جس کے چہرے پر حماقت برس رہی تھی دروازے سے اندر جھانک رہا تھا۔

اس کے کپڑے پھٹے پرانے تھے۔

"کیا میں کچھ دیر کے لئے اندر بیٹھ سکتا ہوں؟"

فرگس نے اشارے میں سرہلا کر اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ فرگس اس کی صورت اور حرکات وسکنات سے دل ہی دل میں کچھ محظوظ ہو رہا تھا۔

"تم یہاں نئے معلوم ہوتے ہو۔" وہ فرگس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"میرا نام میڈل ٹیگ ہے۔" وہ گویا خود ہی اپنے نام سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا' پھر ایک دم خوفزدہ ہو کر قدرے نیچی آواز میں بولا "تم نے میرا تذکرہ تو سنا ہوگا؟ کسی نے تمہیں میری کہانی سنائی؟"

"نہیں۔" فرگس بولا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں میں بھی ایک رنر تھا کوئی معمولی رنر نہیں تھا برق رفتاری سے دوڑتا تھا پھر ایک دن مجھے بین الاقوامی مقابلے کے لئے منتخب کیا گیا۔ جب ریس شروع ہوئی تو بس دیکھتے ہی دیکھتے سب سے آگے نکل گیا۔"

اچانک ہی مفلوک الحال اجنبی نے رونا شروع کر دیا۔

"کیا ہوا..... کیا ہوا تمہیں؟" فرگس نے گھبرا کر پوچھا۔

"انہوں نے مجھے تمغہ نہیں دیا کیونکہ میں ونگ پوائنٹ سے چند قدم پر گر پڑا تھا..... کسی نے مجھے اٹھنے کے لئے سہارا دیا تھا میں اندھوں کی طرح ایک مرتبہ پھر بھاگا اور جیت گیا لیکن انہوں نے مجھے تمغہ نہیں دیا کیونکہ کسی نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔" وہ ایک بار پھر سسکیاں لے کر رونے لگا۔ اور پھر اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

جس دن فرگس نے میڈل ٹیگ سے یہ کہانی سنی تھی اس دن سے میڈل ٹیگ نہ جانے کیوں اسے اپنے ہمدردوں میں شمار کرنے لگا تھا کیونکہ وہ اسے دوسرے لڑکوں کی طرح ڈانٹتا نہیں تھا اور جب کبھی اسے فرگس نظر آتا وہ اسے نئے سرے

سے اپنی تمغہ والی کہانی سنانے لگتا تھا۔

میڈل ٹیگ کو فرگس کے ساتھ اتنی مرتبہ دیکھا گیا کہ اس کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ ان کی طرف اشارہ کرکے کہا جاتا وہ فرگس اور اس کا ٹریز جارہا ہے۔

سیٹی کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوڑ میں حصہ لینے والوں کو ایک جگہ بلایا جارہا تھا۔ بیس کے قریب لڑکے ریس میں حصہ لے رہے تھے۔ وہ سب ایک سیدھ میں زمین پر جھکے کھڑے تھے۔ پستول سے فائر کیا گیا اور ریس شروع ہوئی۔

فرگس ہر خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے پوری یکسوئی کے ساتھ دوڑنے کی کوشش کررہا تھا اس کے دونوں ہاتھوں پر فیلن اور اس کے تین ساتھی دوڑ رہے تھے فیلن پچھلے سال دوسرے نمبر پر رہا تھا۔

تھوڑا فاصلہ عبور کرنے کے بعد فرگس کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ دوڑ رہا ہے اور اس کے سینے کے گرد گویا شکنجہ سا سخت ہونے لگا تھا۔ اب صرف چار لڑکے اس کے ساتھ رہ گئے تھے اور وہ اپنے عقب میں فیلن کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ اب ریس ختم ہونے میں تھوڑا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی رفتار عزم نو کے ساتھ بڑھانے کی کوشش کی اس کے باوجود فیلن بدستور سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ فرگس کو اب کچھ نظر نہیں آرہا تھا اسے بس وہ ریس کا جھنڈا دکھائی دیا جو ریس ختم ہونے کی نشاندھی کررہا تھا اب وہ سب سے آگے تھا اور لوگ جوش و خروش سے چیخ رہے تھے۔ وننگ پوائنٹ کم از کم ایک میل دور تھا اور فیلن اور اس کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا۔

پھر اسے یاد آیا کسی نے کہا تھا کہ "انسان صرف جسم کی طاقت سے ہی نہیں دوڑتا اس کے دل میں طاقت ہونی چاہئے ولولہ ہونا چاہئے۔" کس نے کہا تھا؟

بات بظاہر احمقانہ تھی لیکن بالکل سچی تھی اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی مگر وہ دوڑ رہا تھا، کسی طاقت کے سہارے دوڑ رہا تھا۔

انوکھا اشتہار

ایک شخص نے اخبار میں پڑھا کہ ہم ۵ سو روپے میں ایک ایسی چیز فروخت کر رہے ہیں۔ جس کے پہن لینے سے وہ شخص سب کو دیکھ سکے گا مگر اس کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔

اس شخص نے اخبار پڑھتے ہی ۵۰۰ روپے منی آرڈر کر دیئے اور وہ چیز منگوائی۔ چند دنوں بعد اسے ایک پارسل موصول ہوا اس کمپنی کی طرف سے۔ اس شخص نے اسے جلدی جلدی کھولا۔ تو اس میں سے ایک عدد "برقعہ" نکلا۔ مرسلہ: ش۔ م۔ شہزاد، کراچی

اب بھی وہ دوڑ رہا تھا بالکل اسی طرح فیلن اس کے پیچھے آرہا تھا۔ ان کے پیچھے دور دور تک کوئی نہیں تھا اور آگے آگے لوگوں کا ہجوم چیخ رہا تھا دوڑو..... دوڑو..... ہمت کرو.....!

پھر اسے سڑک کے ایک طرف ایک ڈھانچہ سا نمودار ہوتا دکھائی دیا اور ایک کھردری سی آواز کانوں کو سنائی دی "فرگس! میرے بچے! بس ایک قدم اور..... دل کی طاقت سے دوڑو.....!"

فرگس کا جی چاہا کہ وہ اس کا سہارا لے لے مگر پھر اسے یاد آیا کہ "صرف ایک لمحے کے لئے کسی کے ہاتھ کا سہارا لینے سے تو وہ ڈھانچہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے تمغے سے محروم رہ گیا تھا۔ اسے کسی کا سہارا نہیں لینا ہے، یہی تو ریس کا اصول ہے۔" دس قدم کے فاصلے پر اسے ٹیپ بندھا نظر آرہا تھا۔ اس نے سانس لینے کی کوشش کی تو اس کے سینے میں گویا زخم کا منہ کھل گیا وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا رہا پھر فیلن لڑکھڑایا اور فرگس اس سے اور آگے نکل گیا۔

جس وقت فرگس ٹیپ توڑ کر گرا فیلن اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔ دونوں سڑک پر ڈھیر ہوگئے۔

زبردست شور کے درمیان لوگوں نے اسے اٹھایا فرگس کی آنکھوں کے سامنے سے جب اندھیرا دور ہوا تو سب سے پہلے اسے اپنی ماں کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ فرگس کو یقین نہیں تھا کہ وہ جیتے گا مگر وہ جیت چکا تھا۔

پھر بہت سے لوگ اسے کھینچ کر وکٹری اسٹینڈ پر لے گئے اور اس کے گلے میں طلائی تمغہ ڈالا گیا۔ فیلن اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "مبارک ہو"۔

اچانک ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ڈھانچہ سا لوگوں کے درمیان جگہ بناتے ہوئے اس کے سامنے آیا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے وہ فرگس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے بیٹھی بیٹھی آواز میں بولا "فرگس! میرے بچے! انہوں نے آخر تمہیں تمغہ دے ہی دیا..... کم از کم تمہیں تو تمغے سے محروم نہیں کیا۔" "ہاں مجھے تمغہ مل ہی گیا۔" فرگس نے دھیمی آواز میں کہا اور نہایت آہستگی سے اپنے گلے سے تمغہ نکالا اور میڈل ٹیگ کے گلے میں ڈال دیا۔

"اسے تم رکھ لو..... اور اس کی حفاظت کرنا۔" فرگس نے اس کا استخوانی ہاتھ تھپتھپایا اور اسے وہیں گم صم اور حیران چھوڑ کر اپنی ماں کی طرف چل پڑا جہاں وہ چائے کا تھرماس لئے اس کی منتظر تھی۔

مومو و لورین کی لازوال دوستی

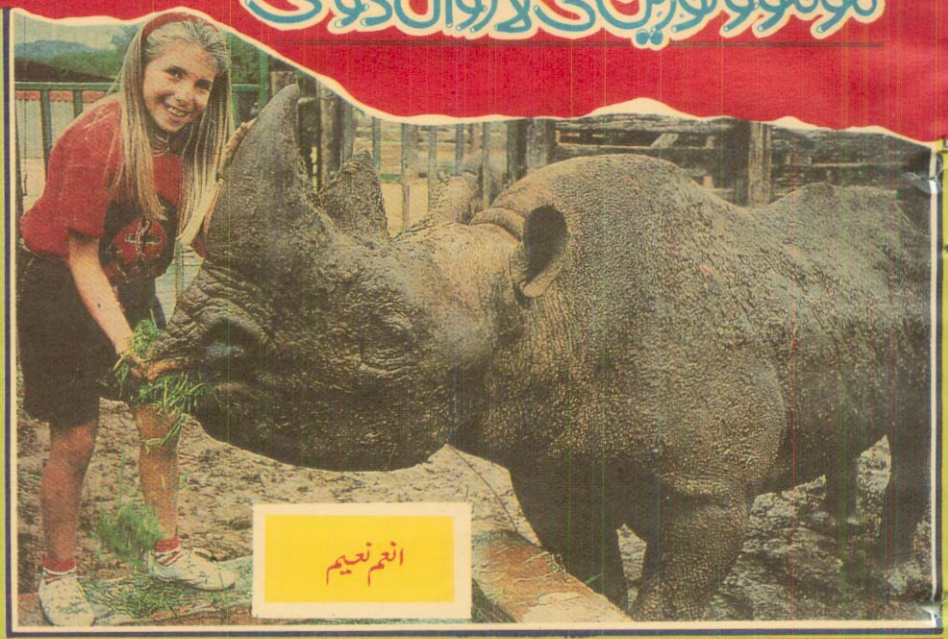

انعم نعیم

گینڈے تو ویسے ہی خطرناک ہوتے ہیں اور اس دو ہزار پونڈ وزنی گینڈے کو تو دیکھنے ہی سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کا مالک جب اس تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے دور سے نشہ آور انجکشن فائر کر کے بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی اس گینڈے کے قریب پھٹک بھی نہیں سکتا۔ سوائے گیارہ سالہ ننھی لورین گوڈن کے۔ لورین کی اس گینڈے سے بہت گہری دوستی ہے۔ وہ جب چاہتی ہے باڑے کے اندر چلی جاتی ہے اور گینڈے کے سینگ سے کھیلنے لگتی ہے۔ اس کے پاپا چیخ کر کہتے ہیں۔ "لورین! اندر مت جاؤ" لیکن وہ پاپا کے خوفزدہ ہونے پر ہنستی ہے اور کہتی ہے: "پریشان نہ ہوں پاپا کچھ نہیں ہوگا" پاپا کہتے ہیں "میں نے ایسی محبت کہیں اور نہیں دیکھی" فوٹو گرافر جب گینڈے اور بچی کی تصویر لینے پہنچا تو گینڈا غضبناک ہو گیا لیکن لورین نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا تب جا کے تصویر بن سکی۔

لوگ حیران ہیں کہ اچھا تو گینڈے کے دل میں بھی رحم اور محبت کا جذبہ ہوتا ہے! لورین کا کہنا ہے "میں جانتی ہوں کہ مومو (اس نے گینڈے کا یہی نام رکھا ہے) مجھے کچھ نہیں کہے گا کیونکہ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی میں اس سے کرتی ہوں۔"

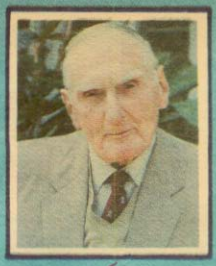

مسٹر ایچ کیچ پال

ایبٹ آباد کی الیاسی مسجد

اسکول کے موجودہ پرنسپل
جناب حسن بدرالدین

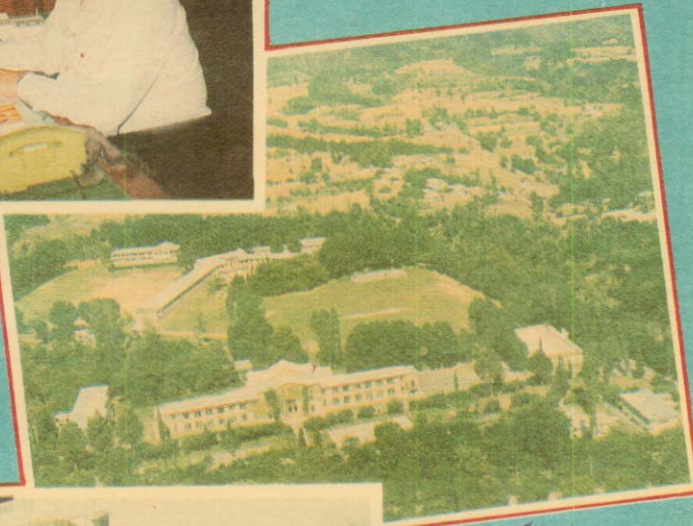

ایبٹ آباد پبلک اسکول
کا ایک فضائی منظر

مسجد کے احاطے میں
نہاتے ہوئے لوگ

تین نسلوں کا استاد

منیر احمد راشد

ایچ کیچ پال ----- عجیب سا نام تھا ---
اور ہمیں کہا گیا تھا کہ ان کا انٹرویو کرنا ہے اور وہ بھی ایبٹ آباد جاکر۔ ہم حیران تھے کہ آخر یہ کون ذات شریف ہیں --- پوچھا۔ "ان کی تعریف؟" کہا گیا۔ "نوے سال کے ہیں اور اب بھی پڑھاتے ہیں۔"

"تو گویا استاد ہیں!"

"جی بڑے بڑوں کے استاد ہیں مثلاً ایئر مارشل اصغر خان، ایئر مارشل نور خان وغیرہ --- پھر نہ صرف پڑھاتے ہیں بلکہ بعض تعلیمی اداروں کے بانی بھی ہیں اور خود اپنے پیسوں سے اسکول کی عمارتیں بنوا کر وقف کرنے کے علاوہ لاکھوں روپے کے وظائف بھی طلبہ کو دیتے ہیں۔

پہلے حیران ہوئے، پھر مرعوب ہوئے پھر خوش ہوگئے کہ ایسی اہم شخصیت سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے۔ لہٰذا فوراً" رختِ سفر باندھا۔ آغا در محمد کو ساتھ لیا اور خود کو بس کے حوالے کردیا۔

چالیس گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد جب ہم ایبٹ آباد پہنچے تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ فوارہ چوک پر کوچ سے اتر کر ہم نے قریب ہی گلی میں موجود ڈرائی کلینر کو کپڑے استری کرنے کے لئے دیئے اور خود سڑک پار کر کے ایک گرم حمام میں گھس گئے۔ حمام کے مالک نے ہمارا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا کیونکہ ہماری آمد سے اس کی جیب گرم ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ جب تک ہم نہائے آغا صاحب اپنے کپڑے، بیگ اور موچی کو جھاڑتے رہے۔ جس نے دوران سفر پھٹ جانے والے بیگ کو بے دردی سے سینے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے آغا صاحب کو ٹھنڈا ہونے کے لئے گرم حمام میں دھکیلا اور خود موچی کی دل جوئی کرنے لگے۔ اس دل جوئی کے نتیجے میں اس نے مناسب پیسوں میں ہمارے جوتوں پر وی آئی پی پالش کردی۔

مندرجہ بالا لوگوں (ہیئر ڈریسر، ڈرائی کلینر اور شو میکر) کے تعاون سے سفر کی گرد اتار اور تھکن لپیٹ کر ہم ایبٹ آباد پبلک اسکول کی طرف عزم سفر ہوئے جو کہ ہماری اصل منزل تھی۔

ابتدائی معلومات کے مطابق اسکول یہاں سے بس کے ذریعے دو روپے اور سوزوکی کے ذریعے بیس روپے کی مسافت پر تھا۔ پیدل نماز جمعہ کی قیمت پر وہاں پہنچا جاسکتا تھا مگر یہ مہنگا سودا ہم نے منظور نہ کیا اور بذریعہ بس اسکول تک جا پہنچے۔ شاہراہ ریشم پر سرسبز پہاڑوں کے دامن میں واقع، گھنے درختوں اور پھول دار پودوں میں چھپے ہوئے اسکول کا بڑا سا گیٹ ہمارے سامنے تھا۔ دائیں بائیں بنے سفید ستونوں اور چیک پوسٹ نما کمروں کے سر پر کیپ نما چھت تھی جس پر بڑے بڑے حروف میں ایبٹ آباد پبلک اسکول اینڈ کالج لکھا تھا۔ سیاہ موٹی سلاخوں والے گیٹ کے پیچھے ملیشیا کی وردی پہنے ایک صحت مند چوکیدار چوکنا بیٹھا، ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ تعارف ہوا۔ ہم یونس انجم صاحب کے مہمان تھے اس لئے داخلے کی اجازت مل گئی۔ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے جس ہستی نے ہمارا استقبال کیا اسے اردو میں بلبل کہتے ہیں۔ اردو شاعری میں محبت کی علامت۔ دو ادیبوں کے لئے اس سے بہتر استقبال ممکن نہیں تھا۔ ساری تھکن اور سفر کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ ہشاش بشاش یونس انجم صاحب کے گھر پہنچے۔ یونس انجم صاحب پبلک اسکول میں اردو کے استاد ہیں۔ بہت مہمان نواز اور ملنسار آدمی ہیں۔ ہمارے میزبان وہی تھے۔ انجم صاحب نے اسکول کے گیسٹ ہاؤس میں ہماری رہائش کا بندوبست کرایا اور نماز جمعہ کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

اسکول کی خوب صورت مسجد میں تمام اساتذہ اور ہاسٹل میں رہائش پذیر تمام طلبہ کے ساتھ ہم نے نماز جمعہ ادا کی۔ پرنسپل صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ہاسٹلز کی سیر کا ارادہ کیا ہاسٹل کو یہاں ہاؤس کہا جاتا ہے اور وارڈن کو ہاؤس ماسٹر۔ انجم صاحب سرسید ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر بھی ہیں۔ میزبان کی چیز کو اپنا سمجھتے ہوئے ہم نے سرسید ہاؤس کا دورہ کیا۔ قدیم طرز کی بنی ہوئی اس قدیم عمارت میں جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہاں کی قدامت پسندی تھی۔ دیواریں، چھتیں، کھڑکیاں، دروازے، الماریاں، پلنگ، ریلنگ، پردے حتیٰ کہ ہاؤس ماسٹر کے دفتر کا فرنیچر اور دیواروں پر آویزاں تصاویر کے فریموں سے بھی قدامت پسندی جھلکتی تھی۔ بعض جگہ تو اس قدیم اثاثے کا اس قدر احترام نظر آیا کہ ہمیں اپنے رجعت پسند ہونے پر فخر ہونے لگا۔ جن دیواری الماریوں کے پٹ دیوار سے دو انچ باہر کھسک آئے تھے انہیں بھی احتراماً واپس نہیں ٹھونکا گیا تھا۔

ایک ایک کمرے میں چھ سے لے کر بارہ پلنگ تک موجود تھے۔ پلنگوں کی قربت سے صاحبان پلنگ کے درمیان اخوت کے مضبوط رشتے کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ یہاں طلبہ کو اسکول سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ طلبہ کو باہر جانے کی نہ تو فرصت ہوتی ہے نہ ضرورت۔ اسکول میں ہر قسم کی کھیل کی ٹیم موجود ہے۔ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، تیراکی، باسکٹ بال وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ہاؤسز میں تفریح کے لئے باقاعدہ وقت دیا جاتا ہے۔ یہاں ٹی وی اور وی سی آر کی سہولت موجود ہے۔ طلبہ مخصوص اوقات میں اپنی من پسند فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس وقت ہاؤس ماسٹر بھی یہاں موجود ہوتے ہیں۔ ہاؤس ماسٹر اور طلبہ کے درمیان محبت کا مثالی رشتہ ہم نے دیکھا۔

سرسید ہاؤس کے برآمدے میں کھڑے کھڑے انجم صاحب نے ہمیں بتایا "مسٹر کیچ پال سے آج ملاقات نہیں ہو سکے گی کیونکہ ان سے صبح کا وقت لیا گیا تھا۔ آپ لوگ ذرا تاخیر سے پہنچے۔ پھر ویسے طویل سفر کے بعد آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔"

واپس گیسٹ ہاؤس آکر ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں آرام کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آرام کے لئے تو تمام رات پڑی تھی۔ تب ہم اور آغا صاحب ایبٹ آباد کی سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چھوٹا سا خوب صورت شہر۔ شفاف سڑکیں، صاف گلیاں اور بازار، ملنسار لوگ، ایبٹ آباد میں دو چیزیں سب سے زیادہ نظر

آئیں۔ ایک فوجی اور دوسرے اسکول۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں تین سو سے زیادہ چھوٹے بڑے اسکول اور کالج موجود ہیں۔ اسی لئے ایبٹ آباد کو درس گاہوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول بھی یہیں ہے۔ اور ایوب میڈیکل کمپلیکس بھی۔ ایبٹ آباد میں دو تفریح گاہیں بہت مشہور ہیں۔ شملہ پہاڑی اور الیاسی مسجد۔ شملہ پہاڑی تو ایک سادہ سا ہل پارک ہے۔ البتہ الیاسی مسجد کی خاص بات وہ چشمہ ہے جو مسجد کے دامن سے پھوٹتا ہے۔ اس میٹھے چشمے کا پانی گرمی میں انتہائی ٹھنڈا اور سردیوں میں نیم گرم ہوجاتا ہے مسجد کے ساتھ ہی باہر کی جانب ایک سوئمنگ پول بنا ہوا ہے جہاں ہر عمر کے لوگ نہانے کا شوق پورا کرتے ہیں۔ شوقین لوگوں کے بے ہنگم شور اور بے لباسی سے مسجد کا تقدس پامال ہوتا ہے مگر اس جانب شاید کسی کی توجہ نہیں ہے۔

اگلے دن ہم اسکول پہنچے۔ صاف ستھرے دو منزلہ اکیڈمک بلاک میں اسکول یونیفارم میں چاک وچوبند اور ہشاش بشاش لڑکے بڑے منظم انداز میں اپنی کلاسوں میں جاتے نظر آئے۔ شور شرابا یا بدنظمی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ کلاسوں میں صرف اساتذہ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یونس انجم صاحب کی معیت میں ہم نے بلاک اور لائبریری کا دورہ کیا۔ بڑے سے لائبریری ہال میں دیوار کے ساتھ ساتھ درجنوں الماریاں کتابوں سے بھری کھڑی تھیں۔ درمیان میں مطالعے کے لئے میز کرسیاں بچھی تھیں۔ لائبریرین اکبر صاحب نے اسکول کے بارے میں ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ اس اسکول کے طلبہ کی ہر سال صوبے بھر میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور ہوتی ہے اور یہ روایت اسکول کے قیام (۱۹۶۱ء) سے قائم ہے۔ ہم اسکول کے موجودہ پرنسپل جناب حسن بدرالدین سے ان کے آفس میں ملے۔ کچھ دیر ان سے ذاتی اور اسکول کے حوالے سے گفتگو رہی۔ حسن بدرالدین صاحب ذہین اور بہترین منتظم ہونے کے علاوہ اوریجنل استاد ہیں۔ اپنی انتظامی مصروفیات کے باوجود وہ بچوں کو پڑھانے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

مسٹر کیچ پال نے دوپہر دو بجے گھر پر ملنے کا وقت دیا۔ حالانکہ ہم کراچی میں ویسے کھا کھا کر لیٹ ہونے کے عادی ہوچکے ہیں۔ مگر یونس انجم صاحب کی دعوت پر بروقت ان کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں سے ان کی گاڑی میں ہم قریب ہی واقع مسٹر کیچ پال کے گھر گئے (تمام اسٹاف کو اسکول کی طرف سے رہائش کی سہولت میسّر ہے)

کال بیل بجانے پر ملازم نے دروازہ کھولا اور

ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود کیچ پال صاحب کو اطلاع دینے چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں کارنس پر اور ریک میں رکھے ہوئے بہت سے اعزازات ہمیں مزید مرعوب کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم ذرا تفصیل سے ڈرائنگ روم کا مشاہدہ کرتے، بغلی دروازے سے مسٹر کیچ پال المونیم کی بیساکھی کے سہارے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے سرخ و سفید رنگت، جھریوں سے پاک چہرہ آنکھوں میں ذہانت، لبوں پر ہر دم کھیلنے والے مسکراہٹ مضبوط ہاتھ پاؤں - - - گویا کھنڈر بتا رہے تھے کہ عمارت عظیم تھی۔ ہم ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے قریب رکھے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد انجم صاحب نے ہمارا تعارف کروایا۔ (انجم صاحب نے اس انٹرویو میں مترجم کے فرائض انجام دیئے انٹرویو انگریزی میں ہوا)

"مسٹر کیچ پال - - - یہ لوگ کراچی سے آئے ہیں - - - ماہنامہ آنکھ مچولی کی طرف سے - - آپ کو یاد ہے کچھ عرصہ پہلے ظفر محمود شیخ صاحب آپ سے ملے تھے - - - حارث اور وحید کے ابو؟ - - -" کیچ پال صاحب نے گردن ہلا کر یاد آنے کا اشارہ دیا۔

"انہوں نے بھیجا ہے انہیں - - - بہت متاثر ہیں وہ - - - آپ سے۔"

"It is not my falt!" کیچ پال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ہم سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ یوں گویا ایک مسکراتے ہوئے انٹرویو کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے تو ہم نے ان کی بیساکھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ پتا چلا کہ ملٹری اکیڈمی دیرہ دون (بھارت) کی سالانہ تقریب ۱۹۹۴ء میں مہمان خصوصی تھے۔ واپسی پر دہلی کے ایک ریستوران میں غسل خانے میں گرنے سے کولہے کی ہڈی چٹخ گئی۔ علاج کے لئے لندن جانے والے ہیں۔ سوالا" جوابا" کیچ پال صاحب کے بارے میں جو ابتدائی معلومات ہوئیں وہ یہ تھیں کہ ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک میں پہلی پوزیشن لی۔ وظیفہ ملا ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہسٹری میں ایم اے کیا۔ اسکول اور یونیورسٹی کے زمانے میں بہترین اسپورٹس مین رہے۔ کھیلوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایتھلیٹکس، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں کے کپتان اور کرکٹ کی ٹیم کے وائس کیپٹن رہے۔ ۱۹۲۸ء میں ایم اے کے فوراً" بعد رائل ملٹری کالج دیرہ دون (ہندوستان) میں اسسٹنٹ ماسٹر کے طور پر ملازم ہوگئے۔ انگلش اور تاریخ پڑھاتے تھے

"آپ پاکستان کب تشریف لائے؟" ہم نے

پوچھا۔

"۱۹۵۳ میں۔"

"بھارت چھوڑنے کی کوئی خاص وجہ؟"

"دراصل ان دنوں ایک قانون بنا تھا۔ جس کی رو سے کوئی بھی غیر ملکی ایک سال سے زیادہ کا کنٹریکٹ نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے اس سے اختلاف تھا۔ اس لئے میں نے چھوڑ دیا۔ حالانکہ انہوں نے مجھے بھارتی شہریت دینے کی پیشکش بھی کی مگر میں نے منظور نہیں کیا اور پاکستان چلا آیا۔ دیرہ دون میں ایک گیسٹ ہاؤس اب بھی میرے لئے وقف ہے اور ہر سال کالج کی سالانہ تقریب میں بھی جاتا ہوں۔"

"پاکستان میں آپ نے کہاں کہاں پڑھایا؟"

"پہلے ایچی سن کالج لاہور میں ۔۔۔ پھر صدر ایوب خان کے ایما پر کیڈٹ کالج حسن ابدال کی بنیاد رکھی۔ اس کا بانی پرنسپل رہا۔ بعد ازاں پی اے ایف کیڈٹ کالج سرگودھا کی بنیاد رکھی، اس کا بانی پرنسپل رہا۔ ۱۹۷۶ء سے اس کالج میں ہوں۔ بحیثیت صدر شعبۂ انگریزی۔

"بحیثیت استاد پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"نظام تعلیم بھی ٹھیک نہیں ہے اور طریقہ تدریس بھی ۔۔۔ خاص طور پر انگریزی کی اگر ہم بات کریں تو آج کل انگریزی سکھانے کے لئے ڈائریکٹ میتھڈ اپنایا جاتا ہے اور اسی کو بہتر سمجھا جاتا ہے جب کہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے ۔۔ ۔ کیونکہ پاکستان میں بچہ اردو زبان میں سوچتا ہے۔ پھر اس کا ترجمہ کرتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ زبان جاننے کے لئے گرامر سیکھنا بہت ضروری ہے۔"

"پاکستان میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم انگریزی زبان میں ہونی چاہئے، جبکہ بعض لوگ اردو کے حامی ہیں ۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہئے۔ یہی فطری طریقہ ہے۔"

"کیا آپ فوج میں بھی رہے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"نہیں میں نے صرف فوجیوں کو پڑھایا ہے انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تو بڑے مشہور مشہور آدمی آپ کے شاگرد رہے ہوں گے؟"

"ہاں ایسا تو ہے ۔۔۔ ایئر مارشل اصغر خان، ایئر مارشل نور خان، صاحبزادہ یعقوب خان، جنرل گل حسن، ایئر مارشل عباس خٹک وغیرہ میرے شاگرد رہے ہیں۔ گورنر فضل حق کو بھی نے پڑھایا ہے۔"

"یہ اتنے بہت سارے اعزازات ۔۔۔۔" ہم

نے کارنس اور ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' "کیا سب آپ کے ہیں؟"

مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

"اور بھی بہت سے ہیں' اسکول کے زمانے سے ایوارڈ لینے کی عادت سی ہے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کون سا ایوارڈ ملا ہے۔ نمایاں اعزازات میں سے حکومت برطانیہ کی طرف سے او' بی' ای۔۔۔ سی بی ای اور حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز شامل ہیں۔"

"مسٹر کیچ پال۔۔۔ ابھی آتے ہوئے ہم نے ایڈمن بلاک پر آپ کے نام کی تختی لگی دیکھی ہے۔ یہ عمارت آپ نے اپنے پیسے سے بنوا کر دی ہے۔ کیا اس کے علاہ بھی آپ نے اسکول کو کچھ عطیہ کیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ایبٹ آباد پبلک اسکول اینڈ کالج کو اس عمارت کے علاوہ ایک کمپیوٹر سینٹر بنوا کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ حسن ابدال کیڈٹ کالج میں بھی دو اسکوائش کمپلکس' ایک Hobies Block تعمیر کروایا اور چار لاکھ روپے طلبہ کو وظائف کے لئے دیئے ہیں۔ بلکہ یہی نہیں جس اسکول سے میں نے میٹرک کیا تھا اس نے مجھے تین سال تک اسکالر شپ دیا۔ جو اس زمانے میں ۱۸۰ پونڈ بنتا تھا۔ میں نے ۱۹۵۰ء میں' جب میرے معاشی حالات بہتر ہو گئے تھے' یہ اسکالر شپ دس گنا بڑھا کر اسکول کو واپس کر دیا تھا۔ اس وقت یہ رقم پچاس ہزار پونڈ بنتی تھی۔ آج کل شاید اس کی مالیت دس لاکھ پونڈ (تقریباً پانچ کروڑ روپے) بنتی ہے۔ ہمیں شدید حیرت ہوئی۔ ہمارے یہاں تو لوگ' اور اکثر غیر مستحق لوگ وظائف کھا جاتے ہیں اور پلٹ کر اپنے تعلیمی ادارے کا منہ تک نہیں دیکھتے۔ یہ بات سن کر ہمارے دل میں ان کی عزت مزید بڑھی۔ ہم نے احترام سے ان کی طرف دیکھا۔ روشن چہرے پر تھکن کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے ہم نے آخری دو چار سوال جلدی جلدی پوچھے۔

"مسٹر کیچ پال آپ کی صحت اور طویل العمری کا کیا راز ہے؟"

ہنس کر کہنے لگے۔ "کھیلوں سے دلچسپی۔ دراصل مجھے اسپورٹس کا جنون کی حد تک شوق

دندان شکن جواب

حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے کسی نے پوچھا۔ انگریز کہتے ہیں کہ داڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے۔ انسان چونکہ داڑھی کے بغیر پیدا ہوتا ہے اس لئے اسے داڑھی کے بغیر ہی رہنا چاہئے۔ مولانا نے فرمایا بھائی پھر تو انگریزوں کو چاہئے کہ اپنے سارے دانت توڑ ڈالیں کیونکہ دانت بھی تو بعد میں ہی نکلتے ہیں۔ مجلس میں سے ایک شخص نے کہا۔ واہ مولانا کیا دندان شکن جواب ہے۔

مرسلہ۔ محمد عظیم قریشی۔ اسلام آباد

ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں ساٹھ باسٹھ سال کی عمر تک ٹینس کھیلتا رہا ہوں۔ اور میں نے کئی ماہر نوجوان کھلاڑیوں کو ہرایا۔ میں اب بھی باقاعدگی سے واک کرتا ہوں۔

"آپ کی عمر اس وقت نوے سال ہے"۔۔۔ بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"نہیں اٹھاسی۔"

"جی جی وہی ۔۔۔ اس عمر میں بھی آپ بچوں کو پڑھانے، ہوم ورک دینے اور کاپیاں چیک کرنے کی مشقت برداشت کرتے ہیں ۔۔۔ جبکہ اس عمر میں تو آپ کو آرام کرنا چاہئے؟"

"آرام موت کا دوسرا نام ہے۔ کام ہی زندگی ہے ۔۔۔ میں کام کرتا ہوں تو زندہ ہوں، کام چھوڑ دوں گا تو مرجاؤں گا۔"

"کیا آپ برطانیہ واپس جائیں گے اپنے بہن بھائیوں کے پاس؟"

"نہیں میں پاکستان ہی میں مرنا پسند کروں گا۔"

"مسٹر کیچپال ۔۔۔" ہم نے آخری سوال کیا۔ "آپ آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے کیا پیغام دیں گے؟"

مسکراتے فرمایا "لکھو ۔۔۔ اور اسے ایسے ہی چھاپ دینا۔"

" Be good if you can!

and do Something "

اس دوران میں آغا در محمد صاحب ہماری تصاویر بنا چکے تھے۔ یادگار کے لئے ہم نے ان کے ساتھ مزید تصاویر بنوائیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس گیسٹ ہاؤس میں آگئے۔

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگوائیں؟

ہمیں قارئین کے ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں وہ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانے کا طریقہ کار دریافت کرتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانا چاہتے ہیں تو ان شماروں کی تفصیل، نصف قیمت کا منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتا ہمیں روانہ کر دیجئے۔ ہم پرچے آپ کو بھجوا دیں گے۔

خط و کتابت کے لئے پتا:

منیجر سرکولیشن، ماہنامہ آنکھ مچولی I۔ پی آئی بی کالونی کراچی ۷۵ فون: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

حضرت ابو جُحیفہؓ نے ایک دفعہ لذیذ سالن کھایا جس میں چکنا گوشت تھا۔ کھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بار بار ڈکاریں لے رہے تھے۔ آپؐ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: "اے ابو جُحیفہ! تم اپنی ڈکار کو ہم سے روکو جو لوگ دنیا میں زیادہ پیٹ بھرتے ہیں وہی قیامت کے دن بھوکے رہیں گے۔" اس بات کا حضرت ابو جُحیفہؓ پر گہرا اثر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اگر وہ صبح کو کھالیتے تو شام کو نہ کھاتے اور اگر شام کو کھالیتے تو صبح نہ کھاتے۔ یہاں تک کہ دنیا چھوڑ گئے۔

شادی یا بربادی

محمد بن مالک

گزشتہ دنوں ہمیں اپنے ایک دُور پَرے کے رشتہ دار کی شادی میں شرکت کا موقع ملا۔ شادی سے ایک ماہ پیشتر ہی تقریبات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ہمیں چونکہ ان سب تقریبوں میں مدعو کیا گیا

تھا' اس لئے ہمیں چاروناچار شرکت کرنا پڑی۔

ایک روز اسی شادی کی تقریب میں معلوم ہوا کہ آج "رسم اُبٹن" ہے۔ دلہن والوں نے شام ہی سے بڑے بڑے تھالوں میں ابٹن گندھوا کے رکھا ہوا تھا۔ رات کو دلہن کی پیشانی پہ ذرا سا ابٹن لگا کر اس رسم کا آغاز کیا گیا۔ بس.... پھر تو غصب ہی ہوگیا۔ پورے گھر کی لائٹیں کسی "داخلی سازش" کے تحت اچانک ہی آف ہوگئیں۔ تمام معزز میزبانان و مہمانانِ گرامی گویا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً" ہی اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر ابٹن کی گولا باری شروع کردی۔ ضروری ہتھیاروں سے وہ پہلے ہی مسلح ہوچکے تھے۔ جن حضرات کو اپنا وقار خطرے میں نظر آیا' انہوں نے صوفوں اور میز کرسیوں کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی اور باقاعدہ مورچہ بندی کر کے "فائرنگ" کرتے رہے۔ جو زیادہ جوشیلے تھے' انہوں نے دست بدست لڑائی کو ترجیح دی۔ ذرا سی دیر میں پورے گھر میں "خانہ جنگی" کا سا سماں پیدا ہوگیا۔ ہم حیرت سے منہ کھولے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی نے ابٹن کا ایک پیڑہ "پھپاک" سے ہمارے منہ پر کھینچ مارا جو کسی بن بلائے مہمان کی طرح آدھے سے زیادہ ہمارے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہوگیا۔ اس افتاد پر ہم بوکھلا گئے۔ پھر قبل اس کے کہ پیادہ فوجیں بھی ہم پر حملہ آور ہوتیں' ہم "تھو... تھو" کرتے ہوئے "کمرہ کارزار" سے فرار ہوگئے۔ لان میں چونکہ مناسب مورچہ بندی نہیں ہوسکتی تھی' اس لئے وہاں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ فریقین ایک دوسرے کی مٹی "پلید" کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے پر اتنا ابٹن تھوپا کہ وہ پورے کے پورے سوکھی گھاس کے ہم رنگ ہوگئے۔ خود کو بچاتے ہوئے جب ہم نے لان کی گھاس پر دوڑ لگائی تو گھاس پر اوندھے پڑے ہوئے اکثر "مفتوحین" ہمارے پیروں تلے آئے' مگر ہمیں نظر نہ آسکے' کیونکہ ابٹن کی زیادتی سے وہ بالکل "کیمو فلاج" ہوگئے تھے۔ ہمیں اپنی اور اپنے لباس کی عافیت خطرے میں نظر آرہی تھی' اس لئے وہاں سے بھاگ نکلے اور صاحب خانہ کے بیڈ روم میں گھس گئے۔ ایک صاحب جن کو ہمارا بے داغ لباس بہت کھل رہا تھا' مستقل ہمارے تعاقب میں تھے۔ چنانچہ ہم ایک بستر کے نیچے جا چھپے۔ پتہ چلا کہ اس کے نیچے پہلے سے ہماری طرح کے دو "ابٹن گزیدہ" حضرات پناہ لئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو ہم اپنے ساتھی "پناہ گزینوں" کے ساتھ کھسر پھسر کرتے رہے' پھر جب لائٹ آنے پر اندازہ ہوا کہ خطرہ ٹل گیا ہے تو لاحول پڑھتے ہوئے اپنی "جائے پناہ" سے

باہر نکل آئے۔ اور ایک عرصے تک ایسی رسومات اور ان کے کرتا دھرتاؤں پر لاحول پڑھتے رہے۔

مگر ہمارا مشاہدہ ابھی یہیں پر ختم نہیں ہوا تھا۔ چند دنوں کے بعد "رسم حنا" یعنی مہندی کی رسم تھی۔ بے پناہ چیخ و پکار اور طوفان بدتمیزی (یعنی شادی بیاہ کے گانوں) کے ساتھ یہ تقریب شروع ہوئی۔ دولہا' دلہن والے گانوں کے نام پر ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو خراب سے خراب تر ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے کہ جب دولہا' دلہن والے ایک دوسرے کو اتنا بُرا سمجھتے ہیں' تو انہوں نے آپس میں رشتہ ہی کیوں کیا؟

دولہا والوں کی طرف سے ایک صاحب اٹھے اور شامیانے کے عین درمیان میں آکر کھڑے ہوگئے۔ پھر جو ان کے جسم پر ایک ہولناک قسم کا لرزہ طاری ہوا تو ہم پریشان ہوگئے۔ مگر پھر پتہ چلا کہ یہ دولہا کے بھائی ہیں' جو اپنے بھائی کی شادی کی خوشی میں "ڈانس" فرما رہے ہیں۔

رات گئے تک "دولہا' دلہن" والے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہے۔ مگر جب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا (یعنی رشتہ برقرار رہا) تو سب ناکام و نامراد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

آخر خدا خدا کر کے نکاح کا دن آپہنچا.... نکاح کے بعد جب چھوہارے بانٹے جانے لگے تو سب لوگ اس طرح چھوہاروں پر پل پڑے کہ ہم ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ ہم نے چاہا کہ ہم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں' لیکن اس کی کوئی صورت' نظر نہیں آئی۔ چھوہاروں پر "معزز مہمانوں" کے حملے اس وقت ختم ہوئے جب چھوہارے بھی ختم ہوگئے۔ ہم احتجاجاً "اس "لوٹ مار" میں شریک نہیں ہوئے۔ (اور کرتے بھی کیا!! چھوہارے جو ختم ہوگئے تھے) کافی دیر تک ہم دل ہی دل میں دوسروں کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ چھوہارے کھا کھا کر یقیناً" ان لوگوں کا پیٹ بھر گیا ہوگا' اب ہم کھانے پر آسانی کے ساتھ ہاتھ صاف کر سکیں گے۔ مگر جب کھانا شروع ہونے کا اعلان ہوا تو وہ بھگدڑ مچی کہ تمام کرسیاں الٹم پلٹم ہوگئیں۔ لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ وہ اپنے آگے کی بھیڑ کو پھلانگ کر ڈائننگ ہال تک پہنچ جاتے۔ چند ایک حضرات تو اس دھکم پیل میں گرے بھی' مگر کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو انہیں دوبارہ اٹھ کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیتی اور وہ پھر سے اس اجتماعی دھکے بازی میں مشغول ہو جاتے۔ خود ہم کئی مرتبہ لوگوں کے تیز رفتار قدموں میں الجھ الجھ کر گرے اور اٹھنے کی کوشش میں اوندھی پڑی ہوئی کرسیوں کے پایوں میں پھنس کر رہ گئے۔

آخر جب بھیڑ چھٹی تو ہم کرسیوں سے پیچھا چھڑا کر بہ ہزار دِقت اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہوئے۔ لباس پر نظر ڈالی تو وہ ہمارے اعمال نامے کی طرح جگہ جگہ سے داغدار ہو رہا تھا۔ لشتم پشتم ڈائیننگ ہال تک پہنچے۔ وہاں پہ تمام خواتین و حضرات کے مابین "وقت کم اور مقابلہ سخت" کی بنیاد پر کانٹے کا مقابلہ ہو رہا تھا جس میں فریقین کا پلہ بالکل برابر تھا۔ چمچوں کے پلیٹوں اور ڈشوں سے ٹکرانے کی آوازیں زور و شور سے گونج رہی تھیں۔ ان سے بھی زیادہ بلند آوازیں ان صاحبانِ عقل و دانش کی تھیں جو دوران طعام حالات حاضرہ پر بھرپور تبصرہ فرما رہے تھے۔ ڈائیننگ ٹیبلز پر "غنیم" کے مسلسل اور شدید حملوں کے پیشِ نظر اندازہ ہوا کہ کھانا شروع ہو کر اپنے عروج کو بھی پہنچ چکا ہے۔ ہم نے خالی پلیٹوں کی تلاش شروع کر دی تاکہ ہم بھی اس مقابلہ خوش خوراکی میں شریک ہو سکیں۔ چنانچہ بہت سی خالی پلیٹیں بہ آسانی دستیاب ہو گئیں مگر اس حالت میں کہ ان میں کھانا کھایا جا چکا تھا۔ چار و ناچار ہم نے سب کی نظر بچا کر ایک پلیٹ دھوئی اور پھر کھانا نکالنے کے لئے "قطار" میں لگ گئے۔ لوگ تمام "غم ہائے دنیا و روزگاری" فراموش کر کے تندہی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت اگر ان سے "جوئے شیر" کھود نکالنے کو کہا جاتا تو وہ یقیناً" اپنے چمچوں سے یہ کام بھی کر دکھاتے..... کافی دیر انتظار کے بعد کسی مہربان نے ایک چمچہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم نے ڈش میں چمچہ بیلچے کی طرح چلانا شروع کر دیا کہ شاید کچھ برآمد ہو جائے مگر وہ تو مفلس کی جیب کی مانند خالی پڑی تھی۔ ہم نے برابر کی ڈشوں میں جھانکا..... ان کا بھی یہی حال تھا۔ یا تو بیرے تھک گئے تھے یا پھر کھانا ہی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ ہال میں موجود دیگر تمام افراد اپنی اپنی پلیٹیں اٹھائے کھانے کا آخری راؤنڈ مکمل کر رہے تھے۔ لے دے کر ایک سوئٹ ڈش باقی رہ گئی تھی۔ اس پر بھی اب حملے شروع ہو چکے تھے۔ چمچے تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش کر رہے تھے اور اسی قدر تیزی سے سوئٹ ڈش اپنے اختتام کو پہنچتی نظر آ رہی تھی۔ ایک بڑے میاں کو کسٹرڈ نکالنے کے لئے جب چمچہ دستیاب نہ ہوا تو انہوں نے بڑے بے صبرے انداز میں اپنی پلیٹ ہی ڈش کے اندر گھسا دی۔ جس سے ان کی پلیٹ کسٹرڈ سے لبالب بھر گئی۔ انہوں نے داد طلب نظروں سے قطار میں لگے ہوئے افراد کو دیکھا' (جس کا جواب انہوں نے گھور کر دیا) اور بڑے فاتحانہ انداز میں پلیٹ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام کسٹرڈ لوگوں کی پلیٹوں اور پھر ان کے "پیٹوں" میں منتقل ہو گیا۔

ہم اس دفعہ بھی سب کے چکی کی طرح چلتے ہوئے "منہ" اور بھری ہوئی پلیٹیں دیکھتے رہ گئے۔ لگتا تھا اس ہال سے ہمارا "آب و دانہ" ہی اٹھ گیا ہے۔

یہ صورت حال صرف ہمارے ساتھ پیش نہیں آئی بلکہ ہم نے اپنے جیسے کچھ اور کمزور اور وضعدار لوگوں کو خالی پلیٹیں لئے ہال میں گھومتے دیکھا۔ غنیمت تھا کہ انہیں پلیٹیں مل گئی تھیں، جنہیں دیکھ دیکھ کر وہ اپنا جی اور پیٹ بہلا رہے تھے۔ جب ہم نے محسوس کیا کہ ہماری زبردست حق تلفی کی گئی ہے تو احتجاجاً" اس تقریب سے واک آؤٹ کر گئے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم آئندہ کے لئے تقریبات میں جانے سے توبہ کر لیتے۔ لیکن ہم نے سوچا کہ جب لنکا میں سبھی باون گز کے ہیں تو ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں۔!! اب ہم بھی شادی بیاہ میں مزے سے ڈٹ کر کھانا کھاتے ہیں۔ چھوہارے تو جتنے ہمارے پیٹ میں ہوتے ہیں، اس سے دگنے ہماری جیبوں میں بھرے ہوتے ہیں۔ اور یوں اب ہمیں کسی تقریب سے بھوکے پیٹ گھر لوٹنے سے نجات مل چکی ہے۔ ہماری وجہ سے دوسرے بھوکے رہ جاتے ہوں تو وہ الگ بات ہے۔ اس کے ذمہ دار ہم نہیں، خود ان کی شرافت ہے۔!

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
——— پہلی پوزیشن ———
——— دوسری پوزیشن ———
یا
——— تیسری پوزیشن ———
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں
بھجوا دیجئے؛

ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ

آنکھ مچولی

1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

کولمبس کہاں دفن ہے؟

عبدالستار حنان طاہر

عزیز ساتھیو! اس سے پہلے آپ "کولمبس اور انڈا" پڑھ چکے ہیں۔ امید ہے کہ کولمبس کے متعلق آپ کو یہ کہانی پسند آئی ہوگی۔ اب آیئے ہم آپ کو کولمبس کے متعلق مزید بتاتے ہیں۔

کولمبس نے سب سے پہلے امریکہ کا جزیرہ "سین سلواڈور" دریافت کیا تھا۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ کولمبس کی ذاتی ڈائری گم ہو گئی تھی۔ لیکن کولمبس کے ایک ہم عصر ملاح "کیساس" کی ڈائری کے مطابق کولمبس سب سے پہلے اسی جزیرے پر اترا تھا۔ کولمبس 1504ء میں سپین کے شہر "والا ڈولڈ" (VALLA-DOLID) میں مر گیا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کی لاش کو "ہسپانولا" کے خوبصورت جزیرے میں دفنایا جائے جسے اس نے سب سے پہلے دریافت کیا تھا (یاد رہے کولمبس نے یہ جزیرہ یعنی "ہسپانولا" امریکہ کے "سین سلواڈور"

جزیرہ سے بھی پہلے دریافت کیا تھا۔ اسلئے اس نے یہ خواہش کی تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں جو سب سے پہلے جزیرہ دریافت کیا تھا اسے وہیں دفن کیا جائے۔) اس جزیرے پر ایک مشہور بندر گاہ "سنٹوڈومنگو" قائم کی گئی تھی اور وہاں بے شمار یورپی باشندے اپنی قسمت آزمانے صدیوں تک آتے رہے۔ 1540ء میں کولمبس کی لاش وہیں دفنایا گیا۔ اس کی لاش سیسے کے تابوت میں ڈال کر سپین سے لائی گئی اور ایک نئے گرجے (CHURCH) میں رکھی گئی۔ اسی قسم کے ایک دوسرے تابوت میں اس کی لاش کے ہمراہ اس کے بیٹے "ڈیگو کولمبس" کی لاش بھی لائی گئی اور اس کی لاش کے ہمراہ اسے بھی اس گرجے میں دفنایا گیا (اس دوران اس کا بیٹا "ڈیگو کولمبس" بھی مرگیا تھا) دونوں قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ دونوں پر سنگ مرمر کے کتبے نصب کئے گئے۔ اور وہ کتبے ایک سو پندرہ سال تک نمایاں طور قائم رہے جن سے دونوں کی قبریں پہچانی جاتی تھیں۔ 1655ء میں انگریزوں نے "سنٹوڈومنگو" پر حملہ کیا۔ گرجے کے لوگوں نے کولمبس کی قبر کو بے عزتی سے بچانے کیلئے سنگ مرمر کے کتبے اور قبروں کا اوپر والا حصہ برباد کر دیا۔ تاکہ کسی قبر کا نشان نہ رہے اور نہ ہی یہ پتہ چلے کہ کولمبس اور اس کے بیٹے کی قبریں کہاں ہیں۔ اسطرح آئندہ ایک سو چالیس سال تک کولمبس کی قبر پر کوئی نشان نہ رہا جس سے اس کی قبر کی تصدیق ہو سکتی۔ 1795ء میں سپین نے یہ جزیرہ فرانس کو دے دیا۔ مگر اہل سپین کولمبس کی لاش کو فرانسیسیوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کولمبس کے تابوت کو "کیوبا" لے جانے کا فیصلہ کیا۔ گرجے کے صحن کے اس حصے کو کھودا گیا اور وہاں سے ایک تابوت نکال کر "ہوانا" بھیجا گیا۔ وہاں کولمبس کا ایک بت بھی نصب کیا گیا۔ 1877ء تک "سنٹوڈومنگو" کے گرجے کی حالت نہایت خستہ ہو چکی تھی۔ اس لئے اسے گرا کر از سر نو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جب مزدور گرجے کے فرش کو خود رہے تھے تو چند فٹ نیچے انہیں ایک تابوت ملا جس پر چند الفاظ لکھے ہوئے دکھائی دیئے یہ الفاظ مندرجہ ذیل تھے۔ "D. de la A. PER-Ate" بڑی تحقیق کے بعد اس کا مطلب یہ نکالا گیا۔ "امریکہ کا دریافت کرنے والا پہلا امیرالبحر۔" تابوت کے تین طرف (C.C.A) لکھا ہوا تھا۔ اس تابوت کی اطلاع فوراً حکومت کو بھیجی گئی اور پھر حکومت کے حکم پر اسے کھولا گیا۔ ڈھکنے کے نیچے ایک تختی پر ایک اور تحریر ملی جس کا ترجمہ تھا۔ "مشہور اور قابل احترام بیرن کرسٹوفر کولمبس۔"

اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس تابوت میں کولمبس ہی کی لاش کی ہڈیاں ہیں اور "ہوانا" کا گرجا ایک غلط کولمبس کی عزت کر رہا تھا۔ جس وقت "سنٹوڈومنگو" سے کولمبس کی لاش لے جائی جا رہی تھی تو کسی کو بھی خیال نہ رہا تھا کہ وہاں دو

ماں

○ سمندر نے کہا ماں ایک ایسی سیپ ہے جو اولاد کے لاکھوں راز سینے میں چھپا لیتی ہے۔

○ بادل نے کہا ماں ایک دھنک ہے جس میں ہر رنگ نمایاں ہے۔

○ شاعر نے کہا ماں ایک ایسی غزل ہے جو ہر سننے والے کے سینے میں اترتی چلی جاتی ہے۔

○ مالی نے کہا ماں ایک گلشن کا وہ دلکش پھول ہے جس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔

○ اولاد نے کہا ماں ممتا کی انمول داستان ہے جو ہر دل میں رقم ہے

○ اور خدا نے کہا ماں میری طرف سے قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔

مرسلہ: ش۔ م۔ شہزاد، کراچی

دوسرے میں اس کے بیٹے کی۔ قبروں کے نشان تو مٹا ہی دیئے گئے تھے۔ غلطی سے سپین والے کولمبس کے بیٹے کی لاش کو ہوانا لے گئے تھے۔ اس دریافت نے دنیا میں سنسنی پھیلا دی۔ حکومت سپین نے اس دریافت کی سچائی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود کہ ہر قسم کی شہادت موجود تھی۔ لیکن انہوں نے اس حقیقت کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اور ہوانا کی قبر کو بدستور کولمبس کی قبر مانتے رہے۔ 1898ء میں کیوبا آزاد ہو گیا۔ ایک بار پھر کولمبس کی لاش کو سرزمین سپین میں تیسری دفعہ منتقل کیا گیا اور یہ لاش جہاں سے چلی تھی وہاں ساڑھے تین سو سال کے زائد عرصہ بعد جا پہنچی۔ حکومت سپین نے ایک شاندار مقبرہ بنیا اور ایک گرجے میں کولمبس کی لاش کو دفنایا گیا۔ مگر دنیا کے بیشتر لوگوں کو معلوم ہے کہ دراصل کولمبس کی لاش سنٹو ڈومنگو میں موجود ہے۔ وہاں کی حکومت نے ایک عالی شان مقبرہ بنیا ہے۔ کولمبس کے تابوت کو ایک تانبے کے بہت بڑے صندوق میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ جس کے دونوں طرف سے تابوت نظر آتا ہے۔ 12 اکتوبر کو ہر سال تانبے کے صندوق کو کھول دیا جاتا ہے اور لوگ ایک جلوس کی شکل میں آکر کولمبس کی یاد تازہ کرنے کیلئے عقیدت سے یہ دن مناتے ہیں۔ سیسے کے تابوت میں صرف چند ہڈیاں باقی ہیں۔ باقی ہڈیاں خاک بن چکی ہیں۔ اس صندوق کی لمبائی چوڑائی 9x17 انچ ہے۔ ان ہڈیوں کے درمیان گولی کا تھوڑا سا حصہ موجود ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ گولی ہڈیوں میں کیسے داخل ہوئی۔ غالباً کولمبس کبھی زخمی ہوا ہو گا اور گولی کا کچھ حصہ اس کے جسم کے حصے میں اس کے مرنے تک موجود رہا اور اس طرح یہ اسکی لاش کا ایک حصہ بن گیا۔ آج کولمبس کے اس مدفن پر جنوبی اور شمالی امریکہ کی حکومتوں نے بھاری رقوم دے کر اس کی شان کو دوبالا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک صلیبی نشان بنیا گیا ہے جو آٹھ سو فٹ بلند ہے۔ مگر اہل سپین اپنی دریافت پر ابھی تک نازاں ہیں اور یہی کہتے ہیں کہ اصلی کولمبس ان کے پاس موجود ہے۔

سلیمان نعمان

جان ہے تو جہان ہے پیارے

پیارے بچو! آپ نے مرزا غالب کا نام سُنا ہوگا۔ سُنا نہیں تو اپنی کورس کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے

تنگ دستی اگر نہ ہو غالبؔ تندرستی ہزار نعمت ہے

مگر ہم میں سے کتنے لوگ اس بات کو مانتے ہیں۔ تندرستی کتنی بڑی نعمت ہے اس کا احساس ہم کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب ہم بیمار پڑ جاتے ہیں اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں اس قسم کے محاورے کتنے عام ہیں: "جان ہے تو جہان ہے پیارے" پھر بھی بیمار پڑے بغیر ہمیں صحت کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ کے لوگ اپنی صحت تو ایک طرف اپنے جانوروں کی صحت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو جتنا خیال وہ اپنے جانوروں کا رکھتے ہیں اتنا تو ہمارے ہاں انسانوں کا بھی نہیں رکھا جاتا۔ ان تصاویر میں دیکھ لیں۔ کہیں شیر کا علاج ہو رہا ہے تو کہیں ہرن کے بچے کے کان میں دوا لگائی جا رہی ہے تو کہیں بندریا کے بچے کو دودھ پلایا جا رہا ہے۔ اچھی باتیں کہیں بھی ہوں انہیں فوراً سیکھ لینا چاہئے۔ کیا یہ تصویریں ہمیں کوئی پیغام نہیں دے رہی ہیں؟

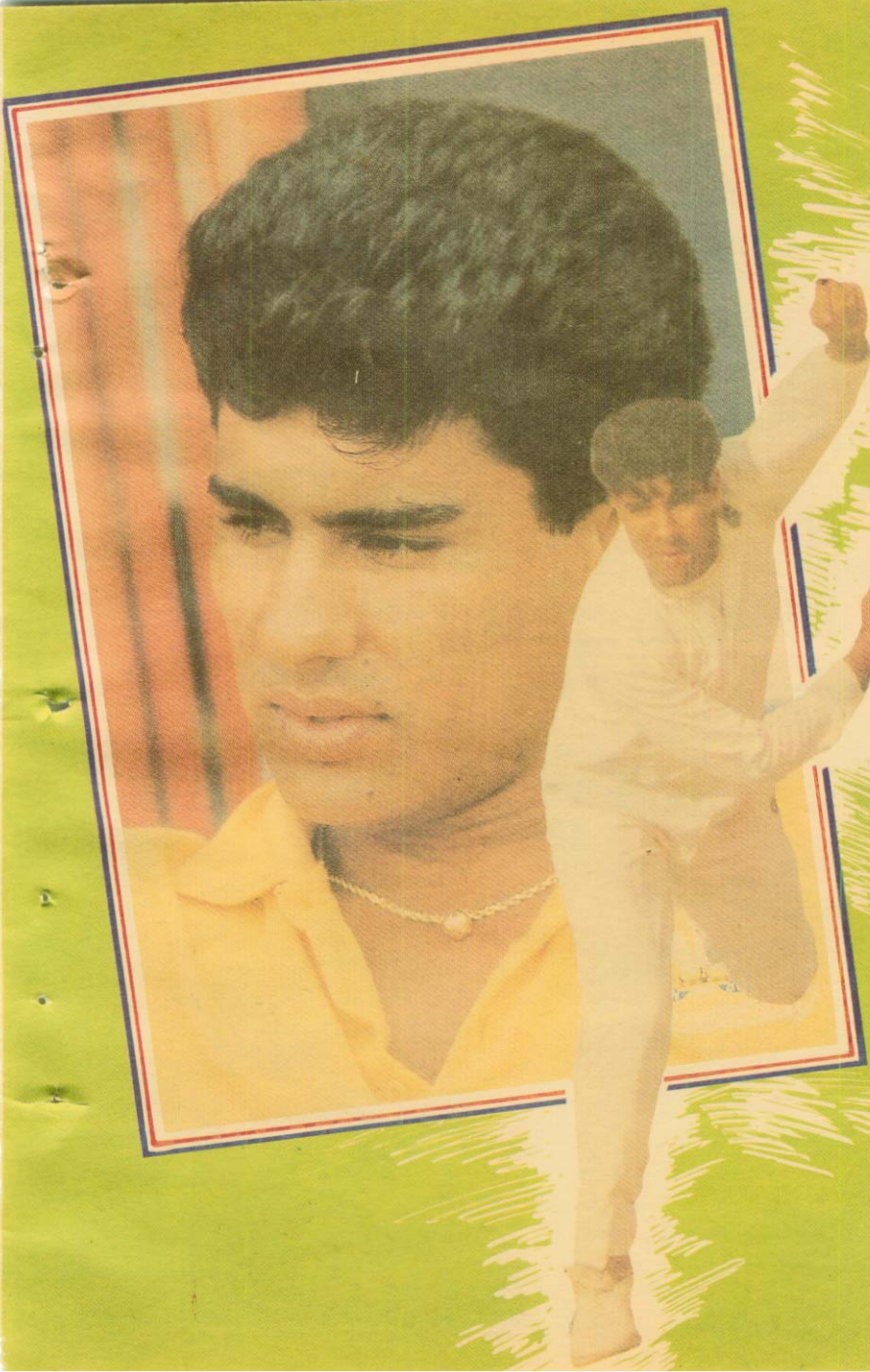

وقار یونس

بوریوالہ ایکسپریس

دنیائے کرکٹ کے عظیم فاسٹ بولر وقار یونس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اتنی کم عمری میں وقار یونس نے دنیا کے تیز ترین بولر کا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ وقار یونس جب بولنگ کرانے کے لئے دوڑتے ہیں تو تماشائی خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی سب ہی "کم آن وقار' وقار" کا نعرہ لگانے لگتے ہیں۔ وقار یونس کو بوریوالہ ایکسپریس' بوریوالہ بم شیل اور نہ جانے کتنے اور القاب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کی تیز رفتار طوفانی بولنگ سے دنیا کا بڑے سے بڑا بیٹسمین خائف رہتا ہے۔ وقار پرانی گیند کو سوئنگ کرانے میں حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں۔ وسیم اکرم کے ساتھ ان کی جوڑی دنیا بھر میں بے حد خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

وقار یونس ۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو بورے والا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۶ سال کی عمر میں کیا۔ انہوں نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۹۰-۱۹۸۹ء میں کراچی میں بھارت کے خلاف کھیلا۔ وقار یونس ایک ٹیسٹ اور ایک ون ڈے میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی قیادت بھی کر چکے ہیں۔ وقار ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی قیادت کرنے والے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں۔

وقار یونس سے ملاقاتیں تو اکثر ہوتی رہتی تھیں مگر آنکھ مچولی کے لئے ان کا انٹرویو ابھی تک نہیں ہوسکا تھا۔ گزشتہ دنوں جب وقار کمر کی تکلیف کے علاج کے لئے لندن جا رہے تھے تب ان سے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی میں ملاقات ہوئی اور یہاں ہم نے وقار کو انٹرویو کے لئے پکڑ ہی لیا۔ اس موقع پر وقار یونس کے دوست ساجد خان بھی موجود تھے۔ وقار یونس سے جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

سوال : وقار بھائی آپ سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ کرکٹ کی دنیا میں کیسے آئے؟

وقار یونس : کرکٹ کا کھیل بچپن ہی سے میرے خون میں رچا بسا ہوا تھا۔ ہماری رہائش شارجہ میں تھی۔ وہاں میں نے چار پانچ سال کرکٹ کھیلی۔ اس کے بعد پاکستان میں صادق

پبلک اسکول بہاولپور کی طرف سے بھی کرکٹ کھیلی۔

سوال : مگر قومی کرکٹ ٹیم میں کس طرح شامل ہوگئے۔ اس کے لئے تو سنا ہے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟

وقار یونس : جی ہاں۔ ہوا یوں کہ سپر ولز کپ کا میچ ہماری ٹیم یو بی ایل اور دہلی کی ٹیم کے درمیان ہو رہا تھا۔ اس میچ میں میری بولنگ عمران بھائی نے ٹی وی پر دیکھی اور وہ میری بولنگ سے متاثر ہوئے۔ بعد میں جب میری عمران بھائی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم شارجہ' ٹیم کے ساتھ جا رہے ہو' اس طرح میں ٹیم میں شامل ہوا۔

سوال : اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں عمران خان کا اہم کردار رہا؟

وقار یونس : جی ہاں' میرا کیریئر بنانے میں عمران بھائی کا بہت بڑا کردار رہا۔ انہوں نے ہر قدم پر مجھے مفید مشورے دیئے۔

سوال : کمر میں تکلیف ہونے کے باعث آپ ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کے فاتح پاکستانی اسکواڈ میں شامل نہیں تھے۔ آسٹریلیا جا کر ان فٹ ہو کر واپس آنے پر آپ کے کیا احساسات تھے؟

وقار یونس : مجھے عمر بھر ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء مس کرنے کا افسوس رہے گا۔ اس وقت ایسا تھا کہ میں ورلڈ کپ کھیل تو سکتا تھا مگر بعد میں کمر کی چوٹ میرے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوتی۔ اور شاید میں آئندہ کرکٹ نہ کھیل سکتا۔ اس لئے میں نے عمران بھائی وغیرہ سے مشورہ کر کے یہی فیصلہ کیا کہ ورلڈ کپ کے لئے مجھے کیریئر کو داؤ پر نہیں لگانا چاہئے اور پھر میں وطن واپس آگیا۔

سوال : ورلڈ کپ کی تاریخی فتح پر آپ کے کیا تاثرات تھے؟

وقار یونس : میں ورلڈ کپ کی کامیابی پر اتنا زیادہ خوش تھا کہ اپنے ساتھی کھلاڑیوں سے ملاقات کے وقت مارے خوشی کے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ مگر خوشی کے ساتھ ساتھ مجھے افسوس بھی تھا کہ پاکستان نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی اور میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔

سوال : آج کل بھی آپ کمر کی تکلیف کا شکار ہیں اور اسی سلسلے میں علاج کے لئے لندن جا رہے ہیں۔ ورلڈ کپ قریب ہے آپ کا کیا خیال ہے کیا آپ جلدی فٹ ہو جائیں گے؟

وقار یونس : جی ہاں' انشاءاللہ مجھے امید ہے کہ میں ستمبر میں سری لنکا کے خلاف ہوم سیریز تک فٹ ہو جاؤں گا۔

سوال : آپ کے ہاتھ کی ایک انگلی کٹی ہوئی ہے یہ کیسے کٹی تھی؟

وقار یونس : یہ میرے پاکستانی ٹیم میں شامل ہونے سے چار ماہ قبل کی بات ہے۔ان دنوں میں یو بی ایل کی طرف سے کھیلتا تھا۔ ہماری رہائش وہاڑی میں تھی۔ ایک روز جب میں اپنے گھر پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں ہے۔ گھر میں داخل ہونے کے لئے میں نے کھڑکی کی گرل (Grill) پکڑ کر اوپر چڑھنا چاہا تو میرا ہاتھ لوہے کی اس گرل میں پھنس گیا اور میرا پیر پھسل گیا۔ میں نیچے گر گیا اس حادثے کے نتیجے میں میری انگلی کٹ گئی اور ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی۔ میں بُری طرح زخمی ہوا دس پندرہ دن تک اسپتال میں داخل رہا۔

سوال : کرکٹ کے علاوہ کون سا کھیل کھیلتے ہیں؟

وقار یونس : میں ہر کھیل کھیلتا ہوں۔ اسکول کے زمانے میں بہترین ایتھلیٹ بھی تھا۔ میں نے ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن، ہاکی، باسکٹ بال، فٹ بال وغیرہ بھی کھیلا ہے۔ اب اسنوکر کھیلتا ہوں۔

سوال : کرکٹرز میں کن کھلاڑیوں کے ساتھ آپ کی دوستی ہے؟

وقار یونس : سارے کھلاڑی اچھے دوست ہیں لیکن انضمام الحق، معین خان، عاقب جاوید، مشتاق احمد، راشد لطیف اور باسط علی سے زیادہ ہم آہنگی ہے۔

سوال : کن فاسٹ بولروں سے آپ متاثر ہیں؟

وقار یونس : سب سے پہلے تو ہمارے ملک کے وسیم اکرم ہیں میرے خیال میں وہ ایک بہترین فاسٹ بولر ہیں۔ عاقب جاوید بھی اچھے ہیں۔ جبکہ دوسرے ممالک کے بولروں میں ای این بشپ، امبروز، میکڈرمٹ بھی اچھے فاسٹ بولر ہیں۔

سوال : وسیم اکرم کے ذکر سے یاد آیا کچھ عرصہ قبل آپ کی ان سے کوئی ناچاقی ہوگئی تھی۔ اب کیسے تعلقات ہیں؟

وقار یونس : اب ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں۔

سوال : آپ کی طوفانی بولنگ سے بڑے سے بڑا بیٹسمین خائف رہتا ہے مگر کوئی نہ کوئی بیٹسمین تو ایسا ہوگا جس کو آؤٹ کرنے کے لئے آپ کو خاصی تگ و دو کرنی پڑی ہوگی؟

وقار یونس : نیوزی لینڈ کے مارٹن کرو مشکل ترین بیٹسمین ہیں ان کے کھیلنے کا طریقہ زبردست ہے۔ ان کے علاوہ لارا، سلیٹر اور جونٹی رہوڈز بھی اچھے بیٹسمین ہیں۔

سوال : پاکستانی بولروں پر گیند کے ساتھ گڑبڑ کرنے کا الزام لگتا رہتا ہے، اس پر آپ کیا کہیں گے؟

وقار یونس : بال ٹیمپرنگ کا تنازع ہر دور میں

اٹھا ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے کہ ہم بال ٹیمپرنگ کرتے ہیں۔ دراصل ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کو پاکستانی ٹیم کی فتوحات ایک آنکھ نہیں بھاتی ہیں۔ جب ہم کاؤنٹی کرکٹ میں وکٹیں لیتے ہیں تو ٹھیک ہے مگر جب ہم پاکستانی ٹیم کے لئے اچھا کھیل دکھاتے ہیں تو فوراً" بال ٹیمپرنگ کا الزام لگ جاتا ہے۔ یہ تمام بے بنیاد باتیں انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔

سوال : آپ کے استاد عمران خان ایک اچھے آل راؤنڈر تھے۔ آپ بھی کچھ بیٹنگ پر توجہ دے رہے ہیں یا نہیں؟

وقار یونس : جی ہاں' میری خواہش ہے کہ میں ایک اچھا آل راؤنڈر بنوں اور اپنے ملک کے لئے کامیابیاں سمیٹوں میں کوشش کر رہا ہوں کہ بیٹنگ بھی اچھی ہو جائے۔

سوال : پاکستان کی ڈومیسٹک کرکٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وقار یونس : پاکستان کی ڈومیسٹک کرکٹ کو مزید بہتر کرنا چاہئے۔ میچوں کی تعداد کم کر کے گراؤنڈ کی حالت پر توجہ دینا چاہئے۔

سوال : فاسٹ بولر عام طور پر غصیلے ہوتے ہیں اور جب ان کی بولنگ پر بیٹسمین چوکا یا چھکا لگاتا ہے یا فیلڈر کیچ ڈراپ کر دیتا ہے تب وہ شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں مگر میں نے آپ میں یہ بات نوٹ کی ہے کہ آپ ہر بات پر ہنس کر رہ جاتے ہیں۔ شاید آپ کو زیادہ غصہ نہیں آتا؟

وقار یونس : (مسکراتے ہوئے) جی ہاں' میرے خیال میں جو ہو جاتا ہے۔ غصہ کرنے سے وہ واپس تو نہیں آجائے گا جیسے کوئی فیلڈر کیچ چھوڑ دے میں اس پر غصہ کروں گا تو وہ کیچ تو واپس نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ غصہ کرنے سے الٹا دلوں میں رنجشیں پیدا ہوں گی اسی لئے میں ایک مسکراہٹ سے بات ہی ختم کر دیتا ہوں۔

سوال : جب لوگ آپ کو بوریوالہ ایکسپریس' بوریوالہ بم شیل کہہ کر پکارتے ہیں تب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

وقار یونس : ہماری عوام ہم کو بہت محبت دیتی ہے ان کی اتنی محبت پا کر ہم لوگوں میں اور جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ ایسا کام کریں جس سے ملک کا نام روشن ہو۔

سوال : ورلڈ کپ ۱۹۹۶ء قریب ہے اس میں پاکستان کی کامیابی کی کتنی امید ہے؟

وقار یونس : بہت زیادہ' سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم اپنے میدان اور اپنے تماشائیوں کے درمیان کھیلیں گے۔ اگر صحیح کمبی نیشن بن گیا تو انشاء اللہ ہم پھر ورلڈ کپ جیتیں گے۔

سوال : اتنی کم عمری میں بولنگ کے اتنے ریکارڈ اپنے قبضے میں کر کے آپ کیسا محسوس

کرتے ہیں؟

وقار یونس : خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ کا احسان ہے۔ بس یہی ہے کہ آئندہ بھی ایسے ہی کھیل کا مظاہرہ کر کے ملک و قوم کا نام روشن کروں۔

سوال : آنکھ مچولی کے قارئین کو کوئی پیغام دیں گے؟

وقار یونس : پیغام یہی ہے کہ اپنی پڑھائی پر بھرپور توجہ دیں۔ کیوں کہ پڑھائی بہت ضروری ہے۔ ساتھ ساتھ فارغ وقت میں کھیل کود اور تفریح میں بھی حصہ لیں۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیئے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیئے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

پیار کروں

جنید حنیف

اپنے رب سے پیار کروں حسرت ہے دیدار کروں
قوت والا، طاقت والا یکتا ہے اقرار کروں
میں تو رب سے پیار کروں

کُن سے بنے ہیں دونوں جہاں سب سے افضل ہے انساں
بھٹک گیا ہے جانے کہاں باطل کا انکار کروں
میں تو رب سے پیار کروں

دنیا ساری پیاری پیاری یہ ہے عمل کی کھیتی ساری
بخش دے اللہ دنیا ساری دن میں دعا سو بار کروں
میں تو رب سے پیار کروں

انساں دھن[1] کا بھوکا ہے دنیا تو اک دھوکا ہے
زیست[2] ہوا کا جھونکا ہے کیوں نہ رب سے پیار کروں
حسرت ہے دیدار کروں
رب سے اپنے پیار کروں

[1] - دولت [2] - زندگی

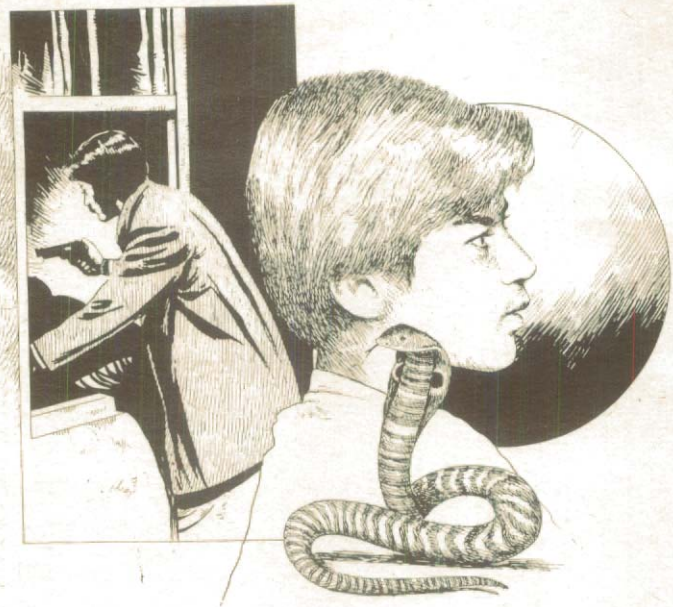

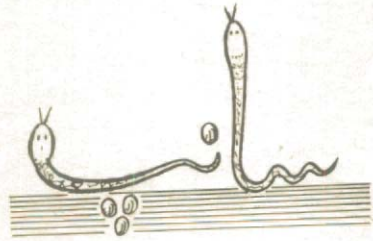

محمد عادل منہاج

بیگم ریحان آنکھیں ملتی ہوئیں اپنے کمرے سے نکلیں۔ جمائی لیتے ہوئے انہوں نے باورچی خانے کا دروازہ کھولا اور پھر ان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور ایک تیز چیخ ان کے حلق سے نکلی۔ دوڑتے قدموں کی آواز گونجی اور ریحان فریدی بھاگتے ہوئے ادھر آئے "کیا ہوا بیگم، خیر تو ہے۔" پھر ان کی نظر بھی باورچی خانے میں پڑی تو وہ دھک سے رہ گئے۔ چولہے پر دودھ کی دیگچی رکھی تھی اور ایک سیاہ رنگ کا چمکدار سانپ دیگچی میں منہ ڈالے دودھ پینے میں مصروف تھا۔ چیخ اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سن کر اس نے دیگچی سے منہ نکال لیا تھا اور اب وہ ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ سانپ ہمارے گھر میں کہاں سے آگیا؟" ریحان فریدی حیرت سے بولے۔

"خ۔۔۔ خدا جانے! بیگم ریحان نے کہنا چاہا مگر اسی وقت سانپ تیزی سے چولہے کے پیچھے کھڑکی سے رینگتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ارے صاحب جی آپ اٹھ گئے۔" اسی وقت ایک آواز گونجی۔ یہ تیرہ چودہ سالہ ایک لڑکا تھا۔

"نعیم ـــــ تم کہاں تھے؟" ریحان فریدی نے پوچھا۔

"جی ـــــ میں دودھ گرم کرکے ذرا باتھ روم تک گیا تھا۔" نعیم نے بتایا۔

"تمہیں پتہ ہے باورچی خانے میں سانپ تھا اور دودھ پی رہا تھا۔"

"سانپ!" نعیم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں ـــــ اور وہ ابھی بھی گھر میں ہوگا۔ اسے تلاش کرو ورنہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پھر ریحان فریدی اور نعیم نے سارے گھر میں سانپ کو تلاش کیا مگر سانپ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

"میرا خیال ہے صاحب وہ گھر سے نکل گیا ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔" نعیم بولا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے مگر حیرت ہے وہ آ کہاں سے گیا۔ اس علاقے میں تو کبھی کوئی سانپ نظر نہیں آیا۔" ریحان فریدی بڑبڑائے۔

○ ------- ○ ------- ○

کھٹکے کی آواز سن کر ریحان فریدی کی آنکھ کھل گئی۔ "کیا گھر میں کوئی ہے؟" انہوں نے سوچا۔ پھر انہوں نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے اپنا پستول نکال لیا۔ دبے پاؤں کمرے سے نکلے۔ برآمدے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا اور گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس گہری خاموشی میں انہیں عجیب سی آواز آئی۔ وہ چوکنے ہو کر باورچی خانے کی طرف بڑھے۔ آواز وہیں سے آ رہی تھی۔ پھر انہوں نے باورچی خانے کے باہر لگا بٹن دبایا اور تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ تیز روشنی میں انہوں نے دیکھا۔ وہی سانپ اس دن کی طرح دیگچی میں منہ ڈالے دودھ پی رہا تھا۔ انہوں نے پستول والا ہاتھ اس کی طرف تانا ہی تھا کہ وہ تیزی سے چھلانگ مار کر اترا اور دروازے سے نکل گیا۔ ریحان فریدی ایک لمحے کو بوکھلا گئے پھر اس کے پیچھے دوڑے مگر وہ ایک کمرے میں گھس گیا تھا۔ یہ نعیم کا کمرہ تھا۔ انہوں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ انہوں نے اس کا دروازہ دھڑدھڑا ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور نعیم کی حیرت زدہ صورت دکھائی دی۔

"یہ ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ اور یہ پستول ـ" دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز سن کر بیگم ریحان بھی ادھر آ گئی تھیں۔

"کھٹکے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں پستول لے کر نکلا تو باورچی خانے میں وہی سانپ نظر آیا۔ میں نے اس پر فائر کرنا چاہا تو وہ

بھاگ کر نعیم کے کمرے میں گھس گیا۔"
"کیا۔۔۔میرے کمرے میں!" نعیم گھبرا کر باہر نکل آیا۔
"آخر۔۔۔۔۔۔آخر یہ سانپ ہر بار ہمارے گھر میں کیوں آگھستا ہے اور وہ بھی دودھ پینے!"
بیگم ریحان پریشان ہو کر بولیں۔
"یہ بات واقعی حیران کن ہے۔ نعیم تم نے رات دودھ فرج میں کیوں نہیں رکھا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی۔۔۔۔۔مم۔۔۔۔میں نے تو فرج میں ہی رکھا تھا۔" وہ پریشان ہو کر بولا۔
"فرج میں رکھا تھا تو کیا سانپ نے فرج کھول کر دیگچی نکالی ہوگی۔" ریحان فریدی نے اسے گھورا۔
"اوہو۔۔۔۔۔۔پہلے سانپ کا کچھ کریں۔"
بیگم ریحان بولیں۔
"وہ ابھی کمرے میں ہی ہوگا۔ میں آج اسے نہیں چھوڑوں گا۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔"
"دیکھیں۔۔۔۔۔کہیں وہ ڈس ہی نہ لے۔"
بیگم ریحان خوفزدہ ہو کر بولیں اور کرسی پر چڑھ گئیں۔
"فکر مت کرو۔ زیادہ تر سانپ بے ضرر ہوتے ہیں۔ وہ بولے اور نعیم کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے احتیاط سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ ایک ایک کونے میں دیکھا مگر سانپ کہیں نہ تھا۔
"حیرت ہے۔۔۔۔۔گھسا تو وہ کمرے میں ہی تھا۔" ریحان فریدی بولے۔
"ہو سکتا ہے صاحب۔ وہ باہر نکل گیا ہو۔" نعیم بولا۔
"مگر کدھر سے۔ دروازے کے سامنے تو میں موجود رہا ہوں۔" وہ بولے ایک بار پھر کمرے کا اور پھر پورے گھر کا جائزہ لیا مگر سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔
"حیرت ہے۔ پہلے بھی یہ اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اور زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ آج نعیم دودھ فرج میں رکھنا بھولا اور آج ہی سانپ آگیا۔" ریحان فریدی بولے۔
"کک۔۔۔کہیں یہ کوئی آسیب نہ ہو۔" بیگم ریحان بولیں۔
"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"
"آپ بے شک نہ مانیں لیکن میری دادی نے ایک بار بچپن میں مجھے ایک واقعہ سنایا تھا۔ کہ ایک جن سانپ کا روپ دھار کر ان کے گھر آیا کرتا تھا۔" بیگم ریحان بولیں۔
"بڑے بوڑھے ایسے قصے سنایا ہی کرتے ہیں۔ خیر پوری طرح ہوشیار رہو۔ اب اگر وہ سانپ نظر آیا تو اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اب میں پستول

ہر وقت اپنے پاس رکھوں گا۔" ریحان فریدی بولے۔

"صاحب! ایسا نہ کریں کہیں بیگم صاحبہ کا خیال درست ہی نہ ہو۔" نعیم بولا۔

"تمہارا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جاؤ جاکر سوجاؤ۔"

○ ------ ○ ------ ○

بستر پر لیٹی ہوئی مریضہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ "اب کیا آپ میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے میرے بچے کو کہیں سے ڈھونڈ کر لائیں۔"

"اسے ہر طرف تلاش کر تو رہے ہیں۔" قریب کھڑا بوڑھا بولا۔

"ذرا سی بات پر آپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ نہ جانے اتنا عرصہ اس نے کہاں گزارا ہو گا۔ کیسے رہا ہو گا؟۔" وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔

"مم---مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ نہ جانے وہ بھی کہاں نکل گیا ہے۔ ہمارے پورے علاقے میں تو وہ کہیں نہیں۔ میرا خیال ہے-------خیر اب میں خود اسے تلاش کرنے نکلتا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ میں اسے ضرور ڈھونڈ کر لاؤں گا۔"

○ ----- ○ ------ ○

کئی دن سکون سے گزر چلے تھے۔ اس دن کے بعد پھر سانپ نظر نہیں آیا تھا۔ اس دن ریحان فرید کو واپسی میں خاصی دیر ہو چکی تھی۔ دس بجے کے قریب وہ گھر لوٹے۔ نعیم نے دروازہ کھولا۔

"نعیم ایک چائے کا کپ بنادو پھر سوجانا۔" وہ بولے۔

"جی اچھا۔" نعیم نے کہا۔ بیگم ریحان سو چکی تھیں وہ جلدی سوجانے کی عادی تھیں۔ ریحان فریدی ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کچھ کاغذات دیکھنے لگے۔ اس دوران نعیم چائے رکھ کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ کام میں مصروف رہے اور چائے پیتے رہے۔ آخر کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھے اور انگڑائی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چائے کا کپ اٹھایا اور جاکر باورچی خانے میں رکھ دیا۔ لائٹ بجھا کر وہ باہر نکلے تو زور سے اچھلے۔ انہوں نے سانپ کو ایک کمرے میں گھستے دیکھا۔

"یہ--پھر آگیا۔ آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔" انہوں نے پستول نکال لیا اور کمرے کی طرف بڑھے۔ یہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے کے قریب پہنچے اور پھر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ پھر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ کمرے میں ایک نہیں دو سانپ موجود تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' دروازہ کھولتے ہی فائر جھونک مارا۔ ایک سانپ کی دم پر گولی لگ کر

اچٹ گئی۔ دونوں سانپ تیزی سے دوسرے دروازے سے باہر نکلے۔ ریحان فریدی بھی پیچھے دوڑے پھر انہوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ برآمدے میں نعیم فرش پر بیٹھا تھا اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ اور ایک بوڑھا اسے سہارا دے کر کھڑا کر رہا تھا۔

"صاحب---یہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی تھی۔" وہ درد سے کراہتا ہوا بولا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں دھواں بن کر غائب ہو گئے۔ ریحان فریدی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

○ ------ ○ ------- ○

"مم---میرا بیٹا آگیا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ ارے یہ تمہاری ٹانگ پر پٹی کیسی ہے۔" مریضہ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"کک---کچھ نہیں امی۔ ذرا چوٹ لگ گئی ہے۔" نعیم بولا۔

"شکر کرو کہ یہ مل تو گیا۔ ناراض ہو کر انسانوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔" بوڑھا بولا۔

"اللہ کا شکر ہے---میرا بیٹا مل تو گیا۔ خبردار جو اب اسے کچھ کہا اور---اور تو بھی یوں ایک دم ناراض ہو کر چلا گیا۔" مریضہ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

"اب نہیں جاؤں گا امی۔" وہ جلدی بولا اور بوڑھا اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔

مصروف ترین زیر زمین ریلوے

دنیا کا سب سے معروف ترین میٹرو نظام گریڈ ماسکو (روس) کا سمجھا جاتا ہے جہاں سالانہ ۳ ارب ۳۰ کروڑ مسافر زیر زمین میٹرو کی ٹرینوں میں سفر کیا کرتے ہیں۔ ماسکو کی میٹرو کے کل ۱۴۱ اسٹیشن ہیں جن میں سے ۱۸ کے دو دو نام ہیں کیونکہ یہ ٹرانسفر ریلوے اسٹیشن ہیں میٹرو کی پٹڑیوں کی کل لمبائی ۱۴۰ میل ہے۔ ماسکو میں زیر زمین ریلوے کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا اور اس وقت اس کا کرایہ ۵ کوپک مقرر کیا گیا تھا۔ ابھی حال ہی میں پہلی بار میٹرو کے کرایہ میں اضافہ کیا گیا ہے اور اب اس میں سفر کے لئے ۱۵ کوپک وصول کئے جاتے ہیں۔

مرسلہ..... محمد سرور، گوجرانوالہ۔

بہادری

ایک دن ایک پہلوان مشہور یونانی شاعر سیمانیدس کے پاس آیا اور اسے اپنی شہزوری کے قصے سنانے لگا۔ سیمانیدس نے پوچھا کہ تم اپنے سے قوی کو پچھاڑ سکتے ہو برابر کو یا کمتر کو پہلوان نے جواب دیا۔ "قوی کو" شاعر نے کہا اگر وہ قوی ہے تو تم سے ہرگز مات نہیں کھا سکتا۔ پہلوان نے کہا اپنے برابر کو شاعر نے جواب دیا تمہارا مقابل اگر ہار گیا تو تمہارے برابر کا کیسے ہوا؟ پہلوان نے زچ ہو کر کہا اپنے سے کمتر کو۔ شاعر نے یہ سن کر کہا بس یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہر شخص اپنے سے کمزور پر غالب آسکتا ہے۔

مرسلہ: عفیفہ اطہر، گدو۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریروں کا کالم

"عظیم کارنامہ" "احسان کا بدلہ" جمشید احمد خان' کراچی۔ "شکر" (؟) "ماں کی دعا" فیصل اکرام شیخ (؟) "غلط فہمی" اعجاز احمد' فیصل آباد۔ "گیت خوشی سے" "اے عالم اسلام" "اے کشمیر کے بچے" "بے بسی" نذرانہ غفار' مینگورہ۔ "انٹرویو" خلیق الرحمان قریشی' ایبٹ آباد۔ "تری کے بیان میں" قرۃ العین مظہر' علی پور۔ "میری کہانی" نعمان اظہر معصوم (؟) "بریف کیس کی رقم" "پاکستان کے قومی شاعر" "محمد بن قاسم کا ہندوؤں سے سلوک" "کمپیوٹر" "قوالی رشوت" "ہمارا گلشن" "ہمارے استاد" "خالو کی کار" "گھڑی" "مزاحیہ خبرنامہ" عرفان محمد حسین واگڑیا' کراچی۔ "زبردستی" عمران رشید' فیصل آباد۔ "یہ ہے ہمارا آنکھ مچولی" جنید احمد شیخ' لاڑکانہ۔ "چھالیہ" احسان عبدالعزیز' کراچی۔ "پچھتاوا" مدیحہ صلاح الدین' کراچی۔ "ہائے ری نفسیات" صائمہ اکرم' صادق آباد۔ "بے حس شارق" "ہارے بھی تو بازی مات نہیں" "ضمیر کو زندہ رکھا کریں" "بکھری خوشبو نظر نہیں آتی" "تیکھا ہے تیکھا" "کس قدر پر سکون تھے نا" صائمہ نادر حسن' حیدر آباد۔ "بلی کے بچے" "میری بہن" باقر شجاع' جہلم۔ "شیر" "تتلی" چوہدری خرم بشیر' لالہ موسیٰ۔ "ایک دلچسپ سفر" سعدیہ اختر' لاہور۔ "مسئلے کا حل" محمد یحییٰ' کراچی۔ "خطرناک مہم" ذیشان نسیم' کراچی۔ "شرمندگی" "رقم پھینک دی" شمس الدین التمش' دوآبہ۔ "جواب دو" خضر حیات' رحیم یار خان۔ "میرا وطن" محمد حیات خان نیازی' راولپنڈی۔ "کاش کبھی ایسا ہو" ناصر محمود' اٹک۔ "اے آنکھ مچولی" آصف علی کھوسہ' "مینگو آئس کریم" عابد علی کھوسہ' مظفر آباد۔ "عید اس روز ہوگی" "کشمیر ہمارا نہیں" حافظ اویس احمد' اوکاڑہ۔ "سوتیلی ماں کا سلوک" (؟) "اپریل فول" سلیم خان' کراچی۔ "بیگ بیتی" نثار الحق اسدی' لاہور۔ "قصہ ماڈرن حاتم طائی کا" حماد عارف' راولپنڈی۔ "باورچی کی سزا" گلفام مصطفیٰ' لودھراں۔ "شب برات کی رات" یاسمین کنول' پسرور۔ "اپریل فول" عمیر الاسلام' کوہاٹ۔ "منزل" فرزانہ صابر' صادق آباد۔ "جسے اللہ رکھے" محمد فاروق کیفی' ڈیرہ اسماعیل خان۔ "ہائے وہ محبت" شکیلہ تبسم' حافظ آباد۔ "ردی کی نوکری سے چند باتیں" محمد آصف جاوید خان' ڈیرہ غازی خان۔ "فالج" محمود فراز قاضی' ہالا۔ "پیاری لڑکی" "زندہ باد" فرزانہ' کراچی۔ "شرارتوں سے توبہ" صبا ناز (؟) "ایک شہزادہ" فخرالنسا جیلانی' لاڑکانہ۔ "دل کی راحت" راؤ نعمت' مٹوٹلی۔ "بھلے شیخ صاحب" "شہر آشوب" "چاچا جی" "ضرورت" عرفان محمد حسین' کراچی۔ "عرض حال" وقاص احمد اعوان (؟) "ناگ اور ناگن" شبانہ شاہ' ٹنڈو آدم۔

فریدہ نذیر

ڈاکٹر شفیق رات کا کھانا کھا کر ٹہلنے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جاکر ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ فون ہسپتال سے آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں سسٹر صفیہ بول رہی ہوں۔ ڈاکٹر حمید نے مجھے فون کرنے کو کہا ہے کیا آپ فوراً آسکتے ہیں؟" "کیوں ....؟" ڈاکٹر شفیق نے پوچھا۔

"ایک بوڑھی عورت ابھی ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئی ہے، ڈاکٹر حمید کے خیال میں فوری طور پر آپریشن ہونا ضروری ہے۔ ڈر ہے کہ اس کا اپنڈکس پھٹ گیا ہے۔"

ڈاکٹر شفیق آٹھ بجے ہی ڈیوٹی ختم کرکے آئے تھے لیکن ان کے خیال میں انسانی زندگی اپنے آرام سے زیادہ اہم تھی۔ اس لئے انہوں نے کہا۔ "آل رائٹ سسٹر! میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"تھینک یو سر۔" نرس نے جواب دیا اور فون رکھ دیا۔

ڈاکٹر شفیق فوراً ہسپتال جانے کے لئے گیراج میں آئے لیکن گاڑی اسٹارٹ کی تو پتہ چلا کہ بیٹری فیل ہو چکی ہے۔ پانچ سات منٹ تک وہ گاڑی

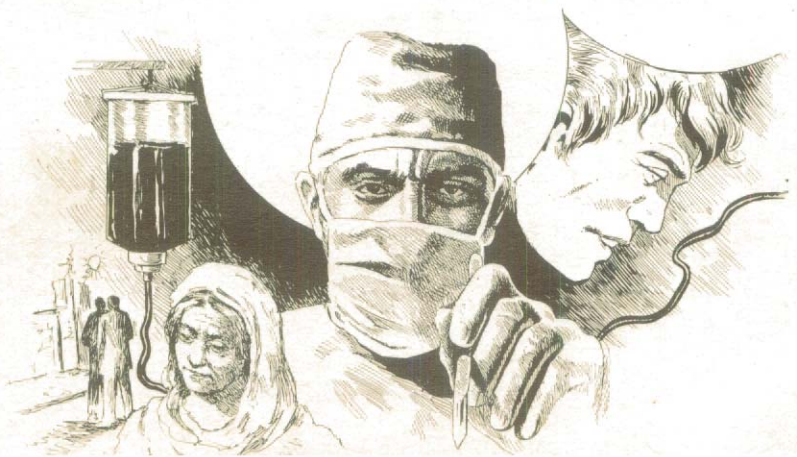

اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہ جانتے تھے مریضہ کی زندگی واقعی خطرے میں ہے اس لئے انہوں نے کار چھوڑ دی اور پیدل ہی چل دیئے۔ انہیں پتہ تھا کہ صرف میل بھر کے فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ ہے چنانچہ راستہ مختصر کرنے کے لئے وہ ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں بجلی نہیں تھی۔ ڈاکٹر شفیق تیز تیز قدم اُٹھاتے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک اندھیری گلی میں سے ایک آدمی اُچھل کر ان کے سامنے آگیا ساتھ ہی ڈاکٹر نے اپنے پہلو میں کوئی چیز چُبھتی ہوئی محسوس کی۔ وہ حیرت سے پلٹنا چاہتے تھے کہ اس آدمی نے کہا۔ "سیدھے کھڑے رہو۔ میرے ہاتھ میں چاقو ہے اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی یا مقابلے کی کوشش کی تو چاقو پسلیوں میں گھُسا دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے چاقو پر ذرا سا زور دیا جس سے چاقو کی نوک شاید جلد میں گھس گئی۔ ڈاکٹر شفیق کے منہ سے گہرا سانس نکلا اور وہ بولے۔ "بھائی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم مجھے ....."

"بک بک مت کرو! جو کچھ جیب میں ہے نکال دو۔" وہ آدمی غُرّایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک گہرا سانس لیا پھر اپنا بٹوا جیب سے نکال کر اسے تھما دیا۔ اسی وقت سڑک کی روشنیاں جل اُٹھیں شاید لائن ٹھیک ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ وہ لُٹیرا اٹھائیس انتیس برس کا نوجوان تھا چہرے پر لمبی لمبی مونچھیں تھیں، آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی جب کہ گال پر کسی زخم کا نشان تھا۔ بٹوا لینے کے بعد اس نے کہا۔ "کلائی سے اپنی گھڑی بھی اُتار دو۔" ڈاکٹر نے جلدی سے گھڑی بھی اُتار دی۔ ڈاکٹر کی اُنگلیوں میں دو سونے کی انگوٹھیاں بھی تھیں غُنڈے نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"انگوٹھیاں بھی اُتار دو۔"

"ان میں سے ایک انگوٹھی بہت تنگ ہے۔" ڈاکٹر شفیق نے کہا۔

"وہ بھی اُتارو!" لُٹیرا غُرّایا۔ ڈاکٹر نے کہا "میں ڈاکٹر ہوں، ہسپتال میں ایک مریضہ کی زندگی خطرے میں ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے تم ایک انگوٹھی لے لو اور مجھے جانے دو۔" یہ کہہ کر انہوں نے ڈھیلی انگوٹھی اُتار کر دے دی۔ غُنڈے نے چاقو کی نوک پر پھر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا۔ تکلیف کی لہر ڈاکٹر کے سارے جسم میں دوڑ گئی شاید نوک جسم میں اندر گھس گئی تھی۔ لُٹیرا غُرّایا۔ "دوسری انگوٹھی بھی اُتارو ورنہ اُنگلی کاٹ دوں گا۔" "کیا تمہیں کسی کی زندگی کی بھی پروا نہیں" .....؟ ڈاکٹر شفیق نے کہا۔

"بکو مت! انگوٹھی اُتار دو وہ مرتی ہے تو مرنے دو۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

ڈاکٹر شفیق نے مجبور ہو کر پانچ منٹ کی کوشش سے دوسری انگوٹھی بھی اُتار دی "کچھ اور ہے تمہارے پاس؟" "نہیں" "بس بھاگ جاؤ۔" وہ غُرّایا۔

ڈاکٹر شفیق بھاگم بھاگ ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچے کچھ انتظار کے بعد ٹیکسی آئی۔ اس میں بیٹھ کر وہ ہسپتال پہنچے لیکن انہیں دیر ہو چکی تھی، مریضہ مر چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے پرس، گھڑی اور انگوٹھیاں جانے کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ دُکھ صرف یہ تھا کہ دیر ہو جانے سے ایک زندگی ختم ہو گئی تھی۔

اس ناخوش گوار واقعے کے چند مہینوں بعد ایک کیس ایمرجنسی وارڈ میں آیا۔ کوئی شخص چلتی ٹرین سے گر گیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ ٹرین سے کٹ گئے تھے۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ موت کے قریب تھا۔ ڈاکٹر شفیق نے جب مریض کو دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ جلدی سے اسسٹنٹ سے کہا "اس کو فوری خون دو اور آپریشن تھیٹر میں لے چلو۔" اسسٹنٹ نے جواب دیا "میں نے خون منگوایا ہے سر! مگر اس گروپ کا خون بلڈ بنک میں صرف دو بوتل ہے جبکہ آپریشن میں ہمیں کم از کم چار بوتل خون کی ضرورت پڑے گی۔" "اس کا کوئی رشتے دار ہے جو خون لا سکے؟" "جی نہیں اس کو پولیس لائی تھی۔" "اس کے خون کا گروپ کیا ہے؟" اسسٹنٹ نے گروپ بتایا تو ڈاکٹر شفیق نے کہا۔ "ارے یہ تو میرے خون کا گروپ ہے تم ایسا کرو میرا خون لے لو۔" "لیکن ڈاکٹر صاحب آپ......" "لیکن ویکن کی ضرورت نہیں ایک زندگی خطرے میں ہے جلدی کرو مریض کو بچانا بہت ضروری ہے۔"

"ڈاکٹر شفیق کے اصرار پر ان کے جسم سے دو بوتل خون لے لیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شفیق نے ہی مریض کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ مریض کی زندگی بچ گئی مگر اس کے ہاتھ وہ واپس نہ دے سکے۔

ڈیڑھ مہینے کے بعد ڈاکٹر شفیق اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ سیکریٹری نے انٹر کام پر کہا۔

"جس مریض کا آپ نے کامیاب آپریشن کیا تھا وہ آج ڈسچارج ہو رہا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"بھیج دو میرے کمرے میں۔"

ڈاکٹر نے اتنا کہہ کر رسیور رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔

دروازہ کھُلا۔ مریض اندر داخل ہوا تو ڈاکٹر کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مریض کی جانب پشت تھی۔ مریض نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ نے میری جان بچانے کے لئے اپنا خون دیا تھا۔ میرے ہاتھ نہیں ہیں جو میں آپ جیسی عظیم ہستی کے پاؤں چھُو سکوں۔"

ڈاکٹر آہستہ سے گھومے۔ مریض اور ڈاکٹر کی نظریں آپس میں ملیں۔ دونوں کچھ دیر خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مریض کچھ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو پہلے کہیں دیکھا

ہے۔"

"ہاں!" ڈاکٹر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "یاد کرو! اب سے سات ماہ پہلے ایک رات تم نے اپنا چاقو میری پسلیوں سے لگا کر میرا پرس، گھڑی اور انگوٹھیاں چھینی تھیں۔ اس وقت میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ڈاکٹر ہوں اور ہسپتال میں ایک مریضہ کی زندگی خطرے میں ہے لیکن اس وقت تمہاری نظروں میں انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ تم نے میرا وقت برباد کر کے مریضہ کی زندگی لوٹ لی تھی۔ آپریشن والے دن میں نے تمہیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ جانا ایک سزا ہے بہر حال تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایک بوڑھی عورت کے قاتل ہونے کے باوجود بھی اللہ نے تمہیں ایک نئی زندگی دی۔ .....

"تمہیں میرا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں جس کا کام تو صرف اپنا فرض پورا کرنا ہے۔"

مریض بہت شرمندہ تھا جب وہ واپس چلا گیا تو ڈاکٹر شفیق کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگے۔ اللہ کا انصاف اس لٹیرے کو دنیا میں ہی مل گیا۔ اُمید ہے اب وہ اچھا انسان بن جائے۔

ٹرائی تھلون کے تین مختلف گریڈ

حیرت انگیز کھیل ٹرائی تھلون

خالد خلیل

ٹرائی تھلون میں شامل کھیل ۔

کھیل کے دوران کھلاڑی کو فراہم کی جانے والی غذا اور پانی

ٹرائی تھلون مشکل کھیلوں میں سے ایک کھیل ہے جس میں کھلاڑی کو تین مختلف مقابلوں میں انتھک اور عظیم قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے اس کھیل میں سب سے پہلے پیراکی پھر سائیکلنگ اور پھر آخر میں پیدل دوڑنا شامل ہے ۔ اس کھیل میں حصہ لینے والے کھلاڑی کو دوڑنے میں مہارت کے ساتھ پیراکی اور سائیکلنگ میں بھی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ٹرائی تھلون تین کھیلوں کا مجموعہ ہے اس کھیل کو بھی تین مختلف گریڈ میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا اولمپک ہے، دوسرا آئرن مین کا مقابلہ اور تیسرا نیا متعارف ہونے والا الٹرامین کا مقابلہ ۔ گو اولمپک مقابلوں میں اس کھیل کو ابھی شامل نہیں کیا گیا لیکن امید ہے کہ سن ۲۰۰۰ء سڈنی اولمپک میں اس کو شامل کرلیا جائے گا ۔ ۱۹۹۶ء کے اٹلانٹا اولمپک میں اس کھیل کو تجرباتی طور پر شامل کیا گیا ہے ۔ نئے متعارف ہونے والے مقابلے الٹرامین میں کھلاڑی کو تین دن تک مسلسل اپنی قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے سب سے پہلے پیراکی میں اس کو ۱۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ہوتا ہے ۔ پھر ۴۰۰ کلومیٹر سے زائد سائیکلنگ کرنی پڑتی ہے اور آخر میں ڈبل میراتھن کے برابر دوڑنا پڑتا ہے ۔ مقابلے کے دوران کھلاڑی اپنی جسمانی قوت کو بے انتہا استعمال کرتے ہیں ۔ جس سے ان کے جسم میں پانی، معدنیات اور وٹامن بے حد کم ہو جاتے ہیں ۔ اسی کمی کو کھیل کے دوران ہی کھلاڑی کو مختلف معدنیات، پروٹین، وٹامن اور پانی فراہم کرکے پورا کیا جاتا ہے ۔ یہ کھیل اس وقت مغربی دنیا میں بے حد مقبول ہے اور وہاں لوگ اس کو چھوٹے پیمانے پر بھی کھیلتے ہیں امید ہے اولمپک میں شامل ہونے کے بعد یہ کھیل عالمی سطح پر مقبول ہوگا ۔

دیوانے ہی زمانے میں کچھ کام کرتے ہیں

قرۃ العین طاہر

دنیا میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ ایک وہ جو نہایت محتاط ہوتے ہیں ۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، ہر معاملے میں عقل سے سوچتے ہیں ۔ اور خوب سوچنے سمجھنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتے ہیں ۔ ایسے لوگ مشکل ہی سے کوئی خطرہ مول لیتے ہیں ۔ جہاں کہیں کوئی نقصان کا اندیشہ ہوا، وہاں سے فوراً بھاگ لیتے ۔ ایسے لوگ ایک اچھی، مطمئن اور کامیاب زندگی گزارتے ہیں ۔ روپیہ پیسہ بھی جمع کر لیتے ہیں اور خوش باش بھی رہتے ہیں ۔ دوسرے قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں ہر وقت ایک بے چینی سی ہوتی ہے ۔ وہ کسی پل نچلے نہیں بیٹھتے ۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی دُھن لگی رہتی ہے ۔ کچھ کر دکھانے کی آرزو ان کے دل میں مچلتی رہتی ہے اور دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے وہ بڑے سے بڑے خطرات بھی مول لیتے ہیں ۔ انہیں کوئی نقصان ڈرا نہیں سکتا ۔ کیونکہ ایسے لوگ بڑے نڈر اور بے باک ہوتے ہیں ۔

آج دنیا میں ہمیں جتنی بھی ترقی نظر آ رہی ہے ۔ یہ دوسرے قسم کے لوگوں ہی کی وجہ سے ہے ۔ کیونکہ "کچھ کر دکھانے" کی آرزو ہی نے انسان سے ساری ایجادات کرائیں، چاند کو تسخیر کرایا، اور فطرت کے راز معلوم کرائے ۔

اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی بننا پسند کریں گے ؟

انتہائی گھنے اور خوبصورت جنگل سندربن میں پائی جاتی ہے۔ بنگال ٹائیگر دلکش جسم اور شاہانہ وقار رکھنے میں دنیا بھر کے شیروں میں ممتاز ہیں۔ نہ جانے تارا کو یہ بات معلوم ہے یا نہیں۔ اسے تو صرف یہ پتا ہے کہ اس کے جاگنے کے تھوڑی دیر بعد اس کے لئے دودھ کی بوتل آجائے گی۔ اور جب کبھی بوتل آنے میں دیر ہوجاتی ہے تو بھوک سے اس کی غراہٹ کی آواز اونچی ہونے لگتی ہے۔ تب میری مسکرا کر کہتی ہے : "کیا تمہیں بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

اور بوتل منہ میں لیتے ہی تارا کا حال کسی ننھے بچے کی طرح ہوجاتا ہے۔ چُس چُس کر کے بوتل کا سارا دودھ اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ میری دودھ ختم ہونے پر اسے شاباشی دیتی ہے۔

تارا امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر ویلیجو میں واقع جانوروں کے پارک میں بہت عیش و آرام سے ہے۔ یہاں جتنے جانور ہیں، ان سب کی دیکھ بھال کے لئے لوگ مقرر ہیں، خوش اخلاق مرد اور مہربان عورتیں جو ان جانوروں کو اس طرح رکھتے ہیں جیسے یہ ان کے اپنے بچے ہوں۔ تارا کی ہی مثال لیجئے۔ آپ تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ میری اس کی غذا، صحت وصفائی اور آرام کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اسے وقت پر دودھ دینا، نہلانا دُھلانا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ باتیں کرنا، کھیلنا کودنا۔۔۔۔

شاید کبھی کبھی تارا کو ایسا لگتا ہے کہ وہ شیر نہیں انسان کی نسل سے ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ میری کا رویہ ایسا ہی ہے اتنا خیال تو شاید اس کی شیرنی ماں بھی نہ رکھ پاتی۔ ہاں مگر ایک بات ہے۔ تارا کی اداسی سے لگتا ہے کہ کبھی کبھی اسے اپنی تنہائی کا بہت احساس ہوتا ہے کیونکہ اس کا کوئی بھائی بہن نہیں ہے۔ اس کی ماں نے اسی پارک میں اسے جنم دیا۔ جب اس کی عمر صرف پانچ دن تھی تو اس کا وزن صرف تین پونڈ تھا۔ میری کی توجہ سے اب اس کا وزن بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ اسے مختلف جراثیم سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً ٹیکے وغیرہ بھی لگائے جاتے ہیں اور عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی غذا میں بھی تبدیلی لائی جارہی ہے۔ جلد ہی وہ وقت بھی آئے گا جب اسے کھانے کے لئے گوشت ملنے لگے گا۔ گوشت کھانے کے بعد ہی تارا شیر کہلانے کا مستحق ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ بوتل سے دودھ پی کر بڑا ہونے والا تارا کیا ویسا ہی بہادر اور بے باک شیر بن جائے گا جیسے شیر سندربن کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب پر آپ کو غور کرنا چاہئے۔

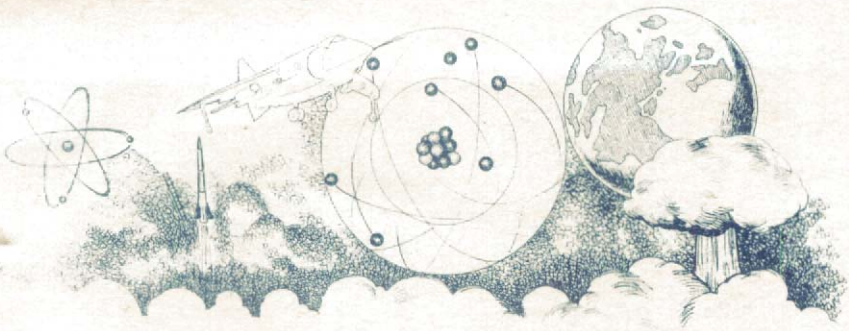

ایٹم

افق دہلوی

ایٹم جوہر چھوٹا سا ہے
ہر دم حرکت میں رہتا ہے
بٹتا نہیں ذرّوں کے اندر
رہتا ہے گردش میں اکثر
ساتھ کسی ذرّے کے مل کر
مالیکیول بنائے جوہر
بنتا ہے خود معمول ایٹم
ہوتا نہیں ذرّے میں مدغم
جوہر ہے یہ بے حد چھوٹا
مشکل تر ہے دیکھنا اس کا
دیتا ہے یہ خوب حرارت
سورج کی سی اس میں جدّت
ایٹم کے مرکز کے اندر
اور اس کے مرکز کے باہر
اور بھی ہوتے ہیں کچھ ذرّے
حرکت میں ہیں جو تیزی سے
بار اس کا ان ذرّوں پر بھی
ہوتا ہے مثبت اور منفی
جس پر بار نہیں ہوتا ہے
وہ بھی تو گردش کرتا ہے
دنیا کی جو چیز بنی ہے
ایٹم کی مرہون ہوئی ہے
کام بہت آیا ہے ایٹم
ذہنوں پر چھایا ہے ایٹم

ہو گی افق اب جنگ ایٹم سے
دنیا آئی تنگ ایٹم سے

تحریری مباحثہ

ٹیوشن رحمت ہے یا زحمت

ایک رائے

ان حالات میں جب کہ اسکولوں سے تعلیم ناپید ہوگئی ہے، ٹیوشن ہی وہ راستہ ہے جس سے ایک طالب علم استاد کی خصوصی توجہ کے ساتھ علم حاصل کرسکتا ہے۔

اِس لئے ٹیوشن رحمت ہے!

ایک دلیل

استادوں نے ٹیوشن سینٹروں کی صورت میں متوازی اسکول قائم کر رکھے ہیں جہاں سے اُن کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جب کہ طلبہ کو کئی گنا زیادہ فیس ادا کرنے کے باوجود سوائے گیس پیپرز کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اِس لئے ٹیوشن زحمت ہے!

آپ کا کیا خیال ہے؟

اپنی رائے ہمیں لکھ بھیجئے ..... لیکن

- آپ کی تحریر تین فل اسکیپ صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔
- کاغذ کے ایک طرف، لائن چھوڑ کر خوش خط لکھا ہو۔
- اور تحریریں ۳۰ راگست ۱۹۹۵ء تک ہمیں موصول ہو جائیں

پتا

تحریری مباحثہ — ماہنامہ آنکھ مچولی، ای پی آئی بی کالونی، کراچی ـ ۱

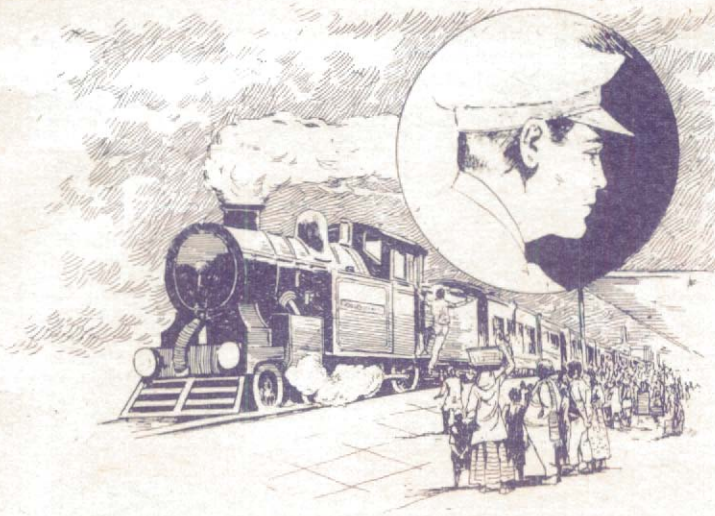

ایک دفعہ کا ذکر ہے

نعیم مشتاق نومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک ریلوے گارڈ تھا۔ وقت کا پابند۔ اپنی ڈیوٹی ہر حال میں نبھانے والا۔ اس کا نام مسٹر پال تھا وہ ایک ذہین انسان تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایسا بھی دن آیا جب اس کی ذہانت جواب دے گئی اِس کا ریکارڈ جو اس نے کئی سالوں کی شب و روز کی محنت سے بنایا تھا، خطرے میں پڑگیا۔ہوا یوں کہ ایک دن اس کی وسل گم ہوگئی۔ وہ صبح کا وقت تھا ٹرین اسٹیشن پر آچکی تھی مسافر اتر رہے تھے اور نئے مسافر بیٹھ رہے تھے اچانک مسٹر پال کو احساس ہوا کہ اس کی وسل اس کے پاس نہیں ہے۔ "میری وسل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!!"۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اب میں کیا کروں۔۔۔؟"

وہ اس وقت پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ جب اسے وہاں ڈھونڈنے پر وسل نہ ملی۔ تو وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ مگر وسل کمرے میں

نہیں تھی۔ "اب کیا کروں؟ - - - - کہاں ڈھونڈوں - - -؟" اس نے پریشان ہو کر خود سے کہا۔

"اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں دیکھتا ہوں.....!!" اسے خیال آیا۔ وہ تیزی سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ لیکن وسل وہاں بھی نہ تھی۔ اس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ "اب کیا ہوگا - - - " وہ بڑبڑایا۔ "میری وسل - - - !" اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے! - - - میری وسل کہاں کھو گئی - - ؟"

وہ چیخا۔ "میں کیا کروں - - -؟"

"ڈانس کرو - - - - !" اس کا طوطا بولا جو قریب ہی ایک پنجرے میں بیٹھا اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ "یوں ! ..... ایسے ! ....." وہ پنجرے میں اوپر نیچے پھدکنے لگا۔

"بکواس مت کرو! - - - - - - - کیپ کوائٹ - !"

وہ اس پر برس پڑا۔ "میری جان پہ بنی ہوئی ہے - - - اور تمہیں اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہیں - - - !" - قریب ہی بکنگ آفس تھا جہاں مسٹر جان بیٹھتا تھا۔ "کیا بات ہے مسٹر پال .....؟" مسٹر جان نے پوچھا۔

"آج صبح صبح پولی پہ برس رہے ہو - - - - !" پولی اس طوطے کا نام تھا جو مسٹر پال نے پال رکھا تھا۔ اور اس وقت وہیں موجود تھا۔ "کک - - - کچھ نہیں مسٹر جان ! - - - کچھ نہیں - - - !" مسٹر پال نے کہا۔

وہ تیزی سے سوچنے لگا۔ "میں کیا کروں؟ کہاں سے وسل ڈھونڈوں؟ - - - جب تک وسل نہیں بجاؤں گا - - - - ٹرین نہیں چلے گی۔"

اس نے وقت دیکھا۔ "سات بج کر اٹھائیس منٹ۔ صرف دو منٹ باقی رہ گئے ہیں! - - - اے خدا! میں کیا کروں؟ میرا برسوں کا ریکارڈ خراب ہونے والا ہے - - - - آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے وسل لیٹ بجائی ہو - - - مگر آج - - - میں کیا کروں؟ - - - کہاں جاؤں ؟"

اینی جو ہر روز اس ٹرین اسکول جاتی تھی۔ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر چلائی۔ "مسٹر پال! - - وسل بجاؤ! - - - میں اسکول سے لیٹ ہو رہی ہوں - - - "! "اسکول سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا - - - اسکول سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا!" پولی چلایا۔

ایمی جو ہر روز اس ٹرین سے سبزی لے کر مارکیٹ جاتی تھی۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال کر بلند آواز میں کہا۔ "مسٹر پال! - - - - وسل بجاؤ! - - - میں مارکیٹ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔" مسٹر پال نے بے بسی سے ہونٹوں پر اپنی زبان

پھیری۔

"مارکیٹ سے لیٹ !!! - - - ہاہاہا - - - مارکیٹ سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا - - - "۔ پولی نے پھر اسی طرح ناچتے ہوئے دہرایا۔

مسٹر اسمتھ بھی ہر روز اسی ٹرین سے اپنی ڈیوٹی پر جاتا تھا۔ اور ہمیشہ دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ آج بھی وہ وہیں براجمان تھا۔ اس نے بھی ہانک لگائی۔ "مسٹر پال! وسل بجاؤ! - - - میں ڈیوٹی سے لیٹ ہو رہا ہوں - - - پلیز - - -!"۔ مسٹر پال نے بے بسی سے تھوک نگلا۔ اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے بولا۔ "کچھ کرو - - - ورنہ آج عزت خاک میں ملنے والی ہے - - - -!"

اس کا طوطا پولی ناچتے ہوئے بولا۔ "ڈیوٹی سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا - - - ڈیوٹی سے لیٹ!!! ہاہاہا"۔ مسٹر فریڈرک جو درمیانی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اپنی بھدی اور موٹی آواز میں چلایا۔

"کیا بات ہے مسٹر پال؟ - - - وسل کیوں نہیں بجا رہے؟ مجھے جاکر اپنی دکان کھولنا ہے - - - - - - - - وسل بجاؤ! - - - - - - - ورنہ میں لیٹ ہو جاؤں گا! - - - - - - - - "مسٹر پال نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے۔ اور کن انکھیوں سے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ سات بجکر انتیس منٹ۔

"کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں آج میں !"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر وہاں کون تھا جو اس کی مدد کرتا۔ " دکان سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا - - - دکان سے لیٹ!!! - - - ہاہاہا!"۔ پولی اپنی مخصوص دھن میں بولا۔

لمبا تڑنگا مسٹر جیک اپنی سیٹ سے نیچے اتر آیا اور سیدھا ڈرائیور کے پاس گیا۔ وہ چڑیا گھر میں ملازم تھا اور ہر روز جانوروں کو ناشتہ دینا اس کی ڈیوٹی تھی۔ "یہ سب کچھ نہیں چلے گا مسٹر ڈرائیور! - - -" مسٹر جیک نے ترش لہجے میں کہا۔ "یاد رکھو! - - - اگر میں وقت پر چڑیا گھر نہ پہنچا - - - تو جانوروں کو ناشتا نہیں ملے گا - - - اور اگر انہیں ناشتا نہ ملا - - - تو مجھ پر جرمانہ ہوگا - - - اور اگر مجھ پر جرمانہ ہوا - - - تو میں تم پر مقدمہ کردوں گا اس لئے اب چل پڑو - -"

"آپ اپنی سیٹ پر تشریف رکھیں - -!"

ڈرائیور نے شائستہ لہجے میں کہا۔ "جیسے ہی وسل ہوئی گاڑی چل پڑے گی - - -!" مسٹر جیک واپس اپنی بوگی میں چلا گیا۔ اور ڈرائیور ایک بار پھر مسٹر پال کی طرف دیکھنے لگا۔ کہ کب وہ وسل بجاتا ہے؟

مسٹر پال بے چارہ نگاہیں چرانے لگا۔

وہ اب بھی کوئی طریقہ سوچ رہا تھا۔ جس

سے وہ اس مشکل صورتحال سے نبرد آزما ہو کر کامیاب ہو سکے۔ اس نے کن اکھیوں سے وال کلاک کو دیکھا۔ "سات بج کر تیس منٹ" ٹرین کا اسٹیشن چھوڑنے کا یہی اسٹینڈرڈ ٹائم تھا۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ٹرین نے وہ اسٹیشن مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی لیٹ چھوڑا ہو۔

اسٹیشن ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ "ارے مسٹر پال!۔۔۔ بھئی! گاڑی لیٹ ہو رہی ہے۔۔ ۔وسل بجاؤ!۔۔۔"

مسٹر پال نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تیرے سوا کون ہے؟ جو اس وقت میری مدد کر سکتا ہے!" اور پھر اسٹیشن ماسٹر، ڈرائیور، مسٹر جیک، مسٹر فریڈرک، مسٹر اسمتھ، ایمی اور اینی نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ جبکہ مسٹر پال حیرت سے اچھل پڑا۔ کیونکہ اسی لمحے ایک باریک، مگر تیز سیٹی کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ اور ٹرین نے ہارن بجا کر اپنے اگلے اسٹیشن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ چھک چھک چھک چھک۔۔۔۔

مسٹر پال حیرت سے پولی کو پٹ پٹ دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ سیٹی کی باریک مگر تیز آواز اسی کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ "وسل مل گئی!!!۔۔

یورینیم کی اہمیت کیوں بڑھ گئی ہے؟

یورینیم سے ایٹمی توانائی حاصل کی جاتی ہے۔ اور آج کل وہی ملک سب سے زیادہ طاقت ور مانا جاتا ہے جو سب سے زیادہ ایٹمی توانائی استعمال کرنے کی اہلیت رکھتا ہو ایٹمی توانائی سے تباہی اور بربادی بھی پھیلائی جا سکتی ہے اور ایک ایٹم بم سے چند سیکنڈ میں لاکھوں انسانوں کو فنا کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تجربہ پچھلی جنگ عظیم میں جاپان کے دو شہروں پر کیا گیا تھا۔ ہیروشیما میں یہ دن اب تک یوم سیاہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور یہ تجربہ اس قدر بھیانک تھا کہ تمام دنیا کانپ اٹھی تھی ایٹمی توانائی کا دوسرا پہلو بہت مفید ہے اس سے بڑی مقدار میں بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بجلی کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اسے گھروں میں اجالا کرنے کے علاوہ بہت سی مشینوں کو چلانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایندھن کے پرانے وسیلے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب کوئلے اور تیل کا ذکر صرف کتابوں میں ملے گا۔ اس لئے ایٹمی توانائی سے بجلی پیدا کرنے اور اس بجلی کو مختلف مقاصد میں استعمال کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔ جن ممالک میں یورینیم خاصی مقدار میں ملتی ہے ان میں کینیڈا اور جنوبی افریقہ قابل ذکر ہیں۔

[illegible]۔ گجرات

۔ہاہاہا۔۔۔ ٹرین چل گئی!!!۔۔۔ہاہاہا۔۔۔"

پولی اپنے مخصوص انداز میں چلّایا۔ "ہاہاہا۔۔۔ واہ واہ واہ!۔۔۔" "یہ وسل تم نے بجائی تھی؟"

مسٹر پال اسے بڑی پیار بھری نگاہوں سے تک رہا تھا "ہاں! میں نے بجائی تھی۔۔۔ ہاں! میں نے بجائی تھی۔۔۔!"۔ پولی نے جواب دیا۔ "لیکن تم نے پہلے تو کبھی وسل نہیں

بجائی ---!" مسٹر پال نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کئی بار بجائی ہے --- لیکن تمہارے سامنے نہیں --- ہاہاہا --- تمہارے سامنے نہیں --- " پولی نے جواب دیا۔

"کس کے سامنے بجائی ہے---؟" مسٹر پال نے پوچھا۔

"اپنے پہلے مالک کے سامنے --- اپنے دوسرے مالک کے سامنے --- مگر تیسرے مالک کے سامنے نہیں --- ہاہاہا --- تیسرے کے سامنے نہیں --- ہاہاہا ---" پولی نے بتایا۔

"اچھا --- میں تمہیں ذرا تفصیل سے بتاتا ہوں --- کیا، کیوں؟ اور کیسے؟"

"بتاؤ ---!" مسٹر پال نے کہا۔

"پہلے مالک نے مجھے بازار سے خریدا --- اسے طوطے پالنے کا بہت شوق تھا --- اس نے مجھے سب سے پہلے سلام کرنا --- اور وسل بجانا سکھایا ---" ۔ پولی نے کہا۔ "پھر ایک دن یوں ہوا --- مالک کا دوست مالک کو ملنے آیا --- اس نے جب مجھے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا --- میں اسے بہت پسند آیا تھا --- اس لئے اس نے مجھے پہلے مالک سے مانگ لیا --- یوں میں دوسرے مالک کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سامنے جب میں نے وسل بجائی --- تو اسے بہت بُری لگی --- اس نے مجھے اسی دن الٹی میٹم دے دیا --- اگر میں نے اب کے وسل بجائی تو میرا کھانا پینا بند --- یوں میں نے وسل بجانا چھوڑ دی --- مگر پھر ایک دن غلطی سے میرے منہ سے وسل کی آواز نکل گئی --- پھر کیا تھا؟ --- اس نے مجھے کھانا دینا بند کر دیا --- اس کے ایک دن بعد تم وہاں آئے --- تم نے مجھے مانگ لیا --- یوں میں تمہارے پاس پہنچ گیا اور پھر آج جب میں نے تمہیں مصیبت میں دیکھا --- تو مجھے یاد آگیا کہ --- میں وسل بجا سکتا ہوں --- سو میں نے وسل بجادی --- ہاہاہا --- وسل بجادی --- ہاہاہا ---" مسٹر پال نے ایک لمبا سانس لیا۔

"سچ ہی کہتے ہیں سیانے ---" مسٹر پال نے کہا۔ "----------"

اب ذرا غور فرمایئے! --- اور بتایئے! --- مسٹر پال نے کیا کہا تھا؟

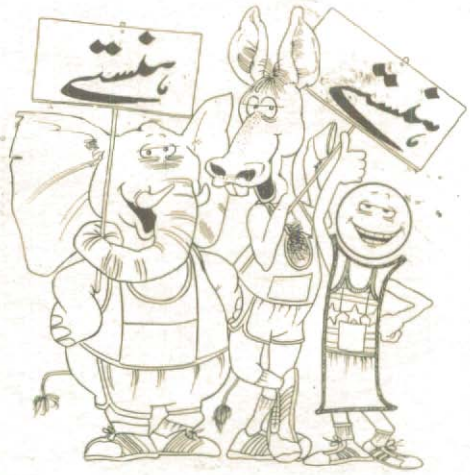

لطائف کے اس سلسلے میں آئندہ سب سے اچھے لطیفے پر انعام بھی دیا جائے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ انعام آپ کو ملے تو گھسے پٹے اور شائع شدہ لطائف نہ بھیجیں بلکہ اچھی اچھی کتابوں سے نئے اور دلچسپ لطائف اور مزاحیہ واقعات ارسال کریں۔ سب سے اچھا لطیفہ بھیجنے والے ساتھی کو بطورِ انعام تین ماہ کے لئے آنکھ مچولی جاری کیا جائے گا۔

ایک شاعر نے انعام کی توقع میں کسی امیر کا زور دار قصیدہ لکھا۔ لیکن انعام سے محروم رہا۔ بے شرمی سے عرض کیا۔ "جناب عالی! کیا ہی اچھا ہو اگر جناب اپنی انگشتری مجھے انعام میں بطور یادگار عطا فرمائیں کہ جب بھی میری نظر انگشتری پر پڑے، بندہ آپ کو یاد کر لیا کرے۔"

امیر نے بے رخی سے کہا۔

"اگر تم مجھے واقعی یاد رکھنا چاہتے ہو تو اس کا ایک آسان طریقہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔"

شاعر نے امید و بیم کی حالت میں دریافت کیا،

"وہ کیا حضور؟"

امیر نے جواب دیا

"تم جب بھی اپنی خالی انگلیاں دیکھنا، مجھے یاد کر لینا کہ فلاں امیر نے مجھے اپنی انگشتری نہیں دی تھی جس سے انگلی خالی رہ گئی۔"

مرسلہ : نزہت فیاض، کراچی

بیٹا : (باپ سے) ابا جان میرے سینگ کیوں نہیں ہیں؟
باپ : کیوں بیٹے؟
بیٹا : ماسٹر صاحب کہتے ہیں "تو اللہ میاں کی گائے ہے۔"

مرسلہ : نصرت رضا، بہاولپور

--- ○ --- ○ ---

ایک ماسٹر صاحب نے اپنے شاگرد کو ٹرین کے کرشمے کے موضوع پر مضمون لکھنے کے لئے دیا۔ شاگرد نے لکھا۔ "رامو ریل کی پٹڑی پر سے جارہا تھا۔ سامنے سے ریل آئی۔ ریل نے "کو" کی۔ رامو بازو ہوگیا اور ریل سیدھی چلی گئی۔"
ماسٹر صاحب نے کہا۔
"عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ یہ کون سا کرشمہ ہوا؟"
شاگرد کو بہت غصہ آیا۔ اس بار اس نے لکھا۔
"رامو ریل کی پٹڑی پر سے جارہا تھا۔ سامنے سے ریل آئی۔ رامو نے "کو" کی۔ ریل بازو ہوگئی اور رامو سیدھا چلا گیا۔"

مرسلہ : مسرت رضا، بہاولپور

--- ○ --- ○ ---

ماں : بیٹا کیا کر رہے ہو؟
بیٹا : امی جان جغرافیہ کے سوالات حل کر رہا ہوں۔
ماں : بیٹا اگر کوئی سوال سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔
بیٹا : (تھوڑی دیر بعد) امی جان دریائے نیل کہاں ہے؟
ماں : غسل خانے میں دیکھ لو صابن کے برابر رکھا ہوگا۔

مرسلہ : واجدہ تصور، سوات

--- ○ --- ○ ---

ایک دیہاتی نیا نیا شہر میں آیا تو دودھ دہی کی دکان پر گیا اور دیکھا کہ دکاندار دودھ کی دھار بنا رہا ہے تو دیہاتی کہنے لگا۔
"دو گز دودھ مجھے بھی دے دو۔"

مرسلہ : افتخار لہڑی، قلات

--- ○ --- ○ ---

بعض اوقات ڈاکٹر اپنی لاپرواہی سے موت اور زندگی کے درمیان فاصلے بہت کم کردیتے ہیں۔ آپریشن ٹیبل پر مریض کو دیکھتے ہوئے سینئر سرجن نے نئے سرجن سے کہا۔
"آپ نے یہ کیسا آپریشن کیا ہے؟"
نئے سرجن نے چونک کر جواب دیا۔
"کیا اس کا آپریشن کرنا تھا --- میں نے تو پوسٹ مارٹم کیا ہے۔"

مرسلہ : نائلہ بختیار، کراچی

--- ○ --- ○ ---

بھئی پرچہ تو ہو گیا تمہیں سوالات کیسے لگے ؟
سوالات تو خیر بہت اچھے تھے مجھے تو اس کے جوابات نے پریشان کر دیا۔
اُف میرے خدا! یہ چوہا... میرا تو دم نکلا جا رہا ہے!
مگر مس آپ تو کہتی تھیں کہ انسان کو صرف خدا سے ڈرنا چاہیئے
سلیم بتلاؤ کہ کثیر الزاویہ شکل کسے کہتے ہیں ؟
سر! مُردہ طوطے کی شکل کو۔
کاش میں آج سے پانچ سو برس پہلے پیدا ہوا ہوتا۔
ارے بھئی کیوں؟
اس طرح میں کم از کم پانچ سو سال کی تاریخ پڑھنے سے تو بچ جاتا۔
بچو! آج رات نو بجے چاند گرہن ہوگا اپنے والدین سے اجازت لے کر دیکھنا نہ بھولیے گا۔
سر! چاند گرہن کا پروگرام ٹی وی کا کون سا اسٹیشن پیش کرے گا؟
Teecher
Teecher
میری سمجھ میں ایک بات آج تک نہیں آئی کہ ہمارے ٹیچر حضرات خود لکھتے پڑھتے کیوں نہیں جو بات انھیں معلوم نہیں ہوتی وہ ہم سے باری باری پوچھنا شروع کر دیتے ہیں؟

کمال نے اپنے ابا سے کہا'
"ابو مجھے باجا لا دیجئے۔"

ابو : بیٹا! باجا تو لا دوں مگر مجھے ڈر ہے کہ تم ہر وقت بجا بجا کر دوسروں کو تنگ کرو گے۔

کمال : نہیں ابو! میں وعدہ کرتا ہوں اسے صرف اس وقت بجاؤں گا جب سب سو رہے ہوں گے۔

مرسلہ : شاہینہ علی بخاری' لاہور

--- ○ --- ○ ---

عمر رسیدہ میاں بیوی نے اپنی صحت کو بہتر رکھنے کے لئے ہر صبح دو میل پیدل چلنے کا ارادہ کیا۔ اگلی صبح ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دونوں بہت تھک گئے۔ میاں نے بیوی سے پوچھا۔
"تم تھک تو نہیں گئیں؟"
بیگم بہت تھک گئی تھیں مگر ان کی ہمدردی دیکھتے ہوئے بولیں۔
"نہیں! ابھی تو میں دو میل اور چل سکتی ہوں۔" اس پر میاں بولے۔
"پھر ایسا کرو کہ واپس جا کر کار لے آؤ۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔"

مرسلہ : عبدالرشید' کمری

--- ○ --- ○ ---

ایک دوست : تمہارے انکل ہمیشہ نشے میں دھت سڑکوں پر گھومتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کسی روز کسی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آکر کچل نہ جائیں۔

دوسرا دوست : انکل کبھی کسی گاڑی کے نیچے نہیں آسکتے۔ تیز سے تیز ترین گاڑی بھی ان کے قریب پہنچ کر رکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

پہلا دوست : اس کی وجہ؟

دوسرا : ان کی قمیض کے آگے اور پیچھے لکھا رہتا ہے۔
خبردار! آتش گیر مادہ۔

مرسلہ : انعام قمر' کوٹ ادو

--- ○ --- ○ ---

کسٹم آفیسر : میں نے بہت دفعہ تمہارے ٹرک کی تلاش لی مگر کچھ برآمد نہیں ہوا۔
تم کیا کرتے تھے۔؟
آدمی : میں اسمگلنگ کیا کرتا تھا۔"
کسٹم آفیسر : مگر آج تک کچھ برآمد نہیں ہوا۔
آخر تم کیا چیز اسمگل کرتے تھے؟
آدمی : میں ٹرک اسمگل کرتا تھا۔

مرسلہ : رعنا فاروقی' اسلام آباد

سوشل سیکورٹی اسکیم

محنت کشوں اور اُنکے اہلِ خانہ کو
معاشی تحفظ فراہم کرتی ہے۔

اس اسکیم کے فروغ میں

ادارہ سماجی تحفظ
ملازمین سندھ

سے تعاون کیجئے۔

منجانب ..... اراکینِ عملہ
سندھ سوشل سیکورٹی
ڈائریکٹریٹ

اب میں کیا کروں؟

میں لیاقت آباد میں رہتا ہوں۔ اس لئے میرا مسئلہ صرف میرا نہیں میرے علاقے کے ان سب بچوں کا مسئلہ ہے جو امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ روزانہ کی ہنگامہ آرائی' دہشت گردی' لاقانونیت نے ہم سب کا جینا دوبھر کردیا ہے۔ میں اٹھارہ انیس سال کے لڑکوں کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھتا ہوں اور جب ان سے کہتا ہوں کہ یہ اسلحہ پھینک دو۔ اس سے تم تباہ ہو جاؤ گے تو وہ ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ ڈرپوک کہیں کے۔۔۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے کئی لوگوں کی لاشیں بھی گر چکی ہیں۔ وہ پولیس اور رینجرز سے مقابلے میں مارے جا چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں کیا کروں۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے پاگل ہو جاؤں گا۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی ہتھیار اٹھالوں لیکن پھر دل کہتا ہے کہ نہیں ہتھیار اٹھانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ سب مسئلے پیار اور محبت سے حل ہوں گے۔۔۔ بھلا بتایئے۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے حل ہوگا۔ میرا اسکول کب کھلے گا۔ میں اسکول کیسے جاؤں گا۔ جاؤں گا بھی یا کسی دن میں بھی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا؟

(نوید کامران۔ لیاقت آباد' کراچی)

جولائی کے شمارے میں ل' ک نے اسلام آباد سے اپنا مسئلہ ارسال کیا تھا۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے والد صاحب انہیں بچوں کے رسالے پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر رسالے پڑھنے کے بجائے یہ وقت اسکول کی پڑھائی کو دیا جائے تو اس سے میٹرک میں اچھی پوزیشن آسکتی ہے۔ جبکہ ل ک کا خیال ہے کہ بچوں کے رسائل پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ والد صاحب یہ بات نہیں مانتے اور ایک بار ان کی پٹائی بھی کر چکے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے ل' ک کا دل اسکول کی پڑھائی سے بھی اچاٹ ہو گیا ہے۔ اسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں کئی ساتھیوں نے اپنی اپنی تجویزیں بھیجی ہیں۔ جو مختصراً درج ذیل ہیں :

عبدالقدیر انڈھڑ' پنوں عاقل : ل'ک نے جو مسئلہ پیش کیا ہے وہ ہمارے ملک کے اکثر بچوں کا مسئلہ ہے۔ پھر بھی انہیں چاہئے کہ وہ اپنے ابو کو قائل کریں کہ فارغ اوقات میں رسائل اور کہانیاں پڑھنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ مطالعہ تو روح کی غذا ہے۔ اور مطالعہ کرنے سے انسان کی سوچ بڑھتی ہے۔ ہمارے ملک کے اکثر والدین اپنے بچوں کو رسائل وغیرہ نہیں پڑھنے دیتے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کورس کے علاوہ اچھی کتابیں پڑھنا بچوں کا حق ہے۔ انہیں اس حق سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔

فرحان معین' کوثر ٹاؤن' کراچی : حدیث شریف یہ ہے کہ ماں باپ کی رضامندی میں اللہ کی رضا ہے اور ماں باپ کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ ل'ک کو چاہئے کہ وہ اپنے ابو سے معافی مانگ لیں اور رسالہ پڑھنا چھوڑ کر پڑھائی پر توجہ دیں' اور جب امتحانوں سے فارغ ہو جائیں تو چھٹیوں کے دوران جب آپ کے ابو گھر پر نہ ہوں تو اپنا یہ شوق پورا کر لیا کریں۔

کنول وحید' گجرات : ل'ک۔ آپ ایسا کریں کہ جب آپ صبح اسکول جانے لگیں تو ابو کے بستر کے پاس ایک خط لکھ کر رکھ دیں۔ اس خط میں آپ ابو کو ساری بات سمجھائیں کہ رسالہ پڑھنا بھی ایک قسم کی تعلیم ہے۔ مجھے امید ہے ابو کو یہ باتیں پسند آئیں گی۔

محمد سلیم بخش' اورنگی ٹاؤن' کراچی : بھائی ل'ک۔ اگر آپ کے ابو آپ کو رسالہ پڑھنے سے روکتے ہیں تو یقیناً" ان کی نظر میں رسالہ بُرا ہو گا۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو ساری توجہ پڑھائی پر دینی چاہئے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ رسالہ پڑھ کر بھی آپ میٹرک میں اچھی ڈویژن لا سکتے ہیں تو اپنے خیال سے ان کو آگاہ کیجئے۔ اسکول کی پڑھائی بہت ضروری ہے۔ اس لئے اس سے دل اچاٹ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

سعدیہ ناز' واہ کینٹ : یہ مسئلہ کافی گھروں کو درپیش ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ آج کل کے طالب علم پڑھائی کو وقت نہیں دیتے اور جاسوسی اور خوفناک کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں --- والدین اسی لئے انہیں رسالے پڑھنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان میں بھی اس قسم کی کہانیاں شائع ہوں گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر آپ اپنے ابو کو ایک مرتبہ آنکھ مچولی کا مطالعہ کروادیں تو مجھے امید ہے کہ وہ پھر آپ کو منع نہیں کریں گے۔ بس آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ ہم

سب اور اللہ آپ کے ساتھ ہے۔

عبید الرحمٰن شیخ، کراچی : آپ اپنے والد کی بات مانیے اور کچھ عرصے کے لئے یہ رسائل بند کردیجئے اپنی پڑھائی پر کافی توجہ دیجئے، میٹرک میں اچھی ڈویژن لاکر دکھایئے پھر انشاء اللہ والد صاحب بھی آپ کا مطالبہ مان لیں گے۔

نوٹ : جون کے شمارے میں ک،ل حیدر آباد کا مسئلہ شائع ہوا تھا۔۔۔ حیرت انگیز طور پر اس مسئلے کے سلسلے میں ہمیں کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ کیا ک،ل کے مسئلے سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں؟ (ادارہ)

انعام یافتہ حل

جناب ل،ک صاحب! ماں، باپ اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی تھوڑی سی بھی تکلیف برداشت نہیں کرسکتے اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے میں اونچا مقام حاصل کریں۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ میٹرک کے طالب علم ہیں اور یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ میٹرک میں اچھی پوزیشن اور نمبر لینے سے آپ کو اچھے کالج میں داخلہ مل سکتا ہے۔ آپ یقیناً" اچھے طالب علم ہوں گے لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ گھر میں اپنے ابو کے سامنے نصاب کی کتابوں کے بجائے رسائل کا مطالعہ زیادہ کرتے ہوں۔ آپ کے ابو نے یقیناً" آپ کے لئے بہت سے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ہوں گے لیکن جب وہ آپ کو اسکول کی پڑھائی میں غرق دیکھنے کے بجائے رسائل میں غرق دیکھتے ہوں گے تو رسالہ چاہے جتنا بھی اچھا ہو وہ آپ کو پڑھنے سے ضرور منع کریں گے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پڑھائی کو دیں جب آپ کے ابو دیکھیں گے تو وہ خوش ہوں گے اور پھر آپ بہت آرام اور نرم و ملائم لہجے میں انہیں ان رسائل کے فائدے بتاسکتے ہیں۔ پھر آپ کے ابو یقیناً" آپ کو رسالے پڑھنے سے منع نہیں کریں گے۔

(بینش حبیب احمد، فیڈرل سی ایریا۔ کراچی)

پہلی مہم

فرحانہ الدین

"ارے! آج تو منگل ہے اور آج تو انکل کو آنا ہے۔" عدیل نے چلّا کر کہا۔ "پھر تو مزہ آجائے گا، یقیناً آج وہ کوئی نئی کہانی لائیں گے!" میں نے بھی خوشی سے جواب دیا۔

فرخ انکل ہمارے ابو کے بہت قریبی دوست ہیں اور بہت مشہور شکاری۔ ان کی زندگی شکار کے دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ وہ ہر ہفتے ہم سے ملنے ہمارے گھر آجاتے ہیں اور واقعی وہ دن ہمارے لئے مسرت سے بھرپور ہوتا ہے۔ انکل فرخ کی عمر اب تو تقریباً پینسٹھ برس کی ہو چکی ہے لیکن دیکھنے میں وہ اب بھی جوان لگتے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد وہ ہمارے کمرے میں آپہنچے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولے "اچھا بچو! آج میں تم لوگوں کو وہ واقعہ سناتا ہوں جسے سن کر تم لوگ میری بہادری اور بے وقوفی پر حیران رہ جاؤ گے۔"

"بہادری بھی اور بے وقوفی بھی!" شازیہ حیران ہو کر بولی۔

"بہادر لوگ تھوڑے سے بے وقوف بھی تو ہوتے ہیں۔" عدیل نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" انکل فرخ بولے۔ "میرا واقعہ اس کی گواہی دے گا۔ یہ واقعہ اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ یہ میری زندگی کے

شکار کا پہلا واقعہ ہے۔"

"پھر تو ہم ضرور سنیں گے!" سب یک زبان ہو کر بول پڑے۔ کیونکہ ہم سب جاننا چاہتے تھے کہ انکل فرخ اتنے بڑے شکاری بنے کیسے؟ انکل نے سنانا شروع کیا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گورنمنٹ ہائی اسکول اجنالہ ضلع امرتسر میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ عمر پندرہ برس کی حد کو چھونے والی تھی۔ گو میں اچھا کھلاڑی تھا مگر خاندان کے دوسرے لوگوں کی طرح اچھا شکاری نہ تھا۔ اس لئے میں نے لڑکپن سے مصمم ارادہ کر لیا کہ اعلیٰ درجے کا شکاری بنوں گا اور ہر قسم کے اسلحے پر مہارت حاصل کروں گا۔ اس زمانے میں کسی نواب یا کسی دولت مند شخص کے پاس ہی بندوق ہوتی تھی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ہر دوسرا شخص ہتھیار اٹھائے پھر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے میرے تایا عباداللہ خان محکمۂ جنگلات میں وائلڈ لائف انسپکٹر تھے، اور ایک اعلیٰ پائے کے شکاری بھی۔ ان کی پوسٹنگ ضلع کانگڑہ سے ملحق پہاڑی ریاست چنبہ میں ہوئی تھی۔ یہ تمام علاقہ جنگلات پر مشتمل تھا اور شیر، بھیڑیے اور ریچھ جیسے خطرناک جانوروں کے شکار کے لئے مشہور تھا۔

میرا بہت دل چاہتا تھا کہ میں بھی کسی روز اپنے تایا کے ساتھ کسی شکاری مہم پر جاؤں۔ آخر اللہ نے میری سن لی۔

میرے تایا عباد اللہ خان کے دوست محمد نواز خان ان دنوں ہمارے گھر کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے تھے۔ ایک دن انہوں نے تایا جان کے ساتھ شکار کھیلنے کا پروگرام بنایا۔ بڑی منت سماجت کے بعد وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے پر رضا مند ہو گئے مگر اس شرط پر کہ مجھے بندوق چلانے میں مہارت حاصل کرنی ہو گی۔

میرے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہو گی۔ میں نے دو دن میں ہی بندوق چلانا سیکھ لی۔ لیکن اتنی جلدی پوری طرح مہارت حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ گھڑ سواری کی مجھے خوب مشق تھی۔

چنبہ کا جنگل ہمارے گاؤں سے تقریباً ۳ میل کے فاصلے پر تھا یہاں پر شیر اور چیتے نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ یہاں ریچھوں کی بہت بہتات تھی۔ اسی لئے تایا جان نے شکار کیلئے اسی جنگل کا انتخاب کیا۔

اگلے روز ہماری روانگی تھی۔ میں صبح ہی صبح اُٹھ بیٹھا۔ ناشتہ کے بعد ہم نے سامان باندھا ہمارے پاس سات ایم ایم کی دو رائفلیں، تین عدد چاقو، دو شکاری کتے اور ہانکے کی ایک ٹولی تھی۔ ہانکا سے مراد پانچ افراد کی ٹولی ہے جو ڈھول اور باجوں سے لیس ہوتی ہے، دورانِ شکار ان کی آوازوں سے جانور بد حواس ہو جاتے ہیں اور ان کے شکار میں آسانی ہوتی ہے۔

میں اپنے تایا جان کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا ان کے دوست محمد نواز خان بھی ایک

دوسرے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک اور گھوڑے پر ہمارا سامان لدا ہوا تھا جن میں پانی سے بھری صراحی بھی تھی (اس زمانے میں واٹر کولر کا رواج نہ تھا) اور کچھ خورد و نوش کا سامان تھا۔ ہانکے کے پانچ افراد ہم سے پہلے ہی شکار گاہ پر پہنچ چکے تھے۔

بالآخر ہماری منزل آگئی۔ یہ جنگل میں موجود ایک تنگ درّہ تھا جہاں ایک چشمہ بھی موجود تھا۔ جنگلی جانور ادھر پانی پینے آتے تھے۔

شام ہو چکی تھی ہم نے اس تنگ سے درّے کے بیچ خیمے گاڑ دیئے اور ارد گرد آگ لگا دی یہ سب کام ہمارے خاندانی ملازم بخشو نے کیا۔ بخشو بہت ذمہ دار اور فرض شناس آدمی تھا وہ یہاں کے خطرناک راستوں سے بخوبی واقف تھا اسی لئے ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

بخشو نے شکاری کتوں کو ایک طرف باندھ دیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرنے کے بعد ہم نے خورد و نوش کا سامان نکالا اور کھانا کھا کر سو گئے۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی نہ جانے کیوں میرے دل میں نامعلوم خوف بیٹھ گیا تھا — یہ میری زندگی کی پہلی مہم تھا اس لئے مجھے کافی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

لکڑیوں کی آگ بھی سرد پڑنے لگی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ اچانک فضا ایک دہشت ناک چیخ سے گونج اُٹھی اس کے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی تیز آوازیں سنائی دیں انہیں آوازوں میں کسی جنگلی جانور کی دہشت ناک غراہٹ بھی شامل تھی۔

میرے تایا اور ان کے دوست جاگ اُٹھے اور بندوق اُٹھا کر اس مقام کی طرف دوڑ پڑے جہاں سے چیخوں کی آواز آئی تھی، میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ ہانکے والے بھی جاگ اُٹھے تھے، اور ان کے ڈھول اور باجوں کی آوازوں سے ماحول اور دہشت ناک ہو گیا۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے انسانی چیخوں کی آواز آئی تھی تو دہشت سے میرا کلیجہ حلق کو آ گیا۔ وہ منظر میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ ہمارا ملازم بخشو موت کی نیند سو رہا تھا اس کا آدھا چہرہ کٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی ایک آنکھ غائب تھی۔ قریب ہی ریچھ کے پنجوں کے نشانات تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے اپنا شکاری چاقو سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔ پیچھے سے تایا جان وغیرہ آوازیں ہی دیتے رہ گئے۔ لیکن میں تو جیسے اپنے آپے ہی میں نہیں تھا۔ گھوڑا شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازوں کے رُخ پر بھاگتا جا رہا تھا۔ کیونکہ شکاری کتوں کی رسی ٹوٹ چکی تھی اور شاید وہ بھی ریچھ کے تعاقب میں بھاگ لئے تھے اور ریچھ، وہ بھی شاید ہانکے کی آوازوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ تقریباً تھوڑی دور تک گھوڑا بھگانے کے بعد میں اس مقام تک جا پہنچا جہاں

ریچھ موجود تھا۔ شکاری کتے ریچھ کے بدن سے لپٹے ہوئے بھونک رہے تھے۔ پھر ایک کتا زمین پر گر گیا۔ ریچھ نے اس کی گردن بھنبھوڑ ڈالی تھی۔ گھوڑا، ریچھ کو دیکھ کر بدک گیا اور بھاگ نکلا۔ زمین پر گرنے سے میرے بائیں بازو پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ میں نے ہمت کر کے خنجر نکالا۔ اس کا پھل تقریباً دس انچ لمبا تھا۔ میں نے تاک کر خنجر پھینکا جو ریچھ کو لگنے کی بجائے کتے کو لگ گیا ایک زور دار غراہٹ کی آواز آئی اور دوسرا کتا میرے ہی ہاتھوں ڈھیر ہو گیا۔ اب ریچھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا خوفناک ترین لمحہ تھا۔ موت میرے سر پر کھڑی تھی۔ بخشو کا خون میں ڈوبا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا بھی وہی حشر ہونے والا تھا۔ میں خدا سے مدد کیلئے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اچانک مجھے گھوڑوں کی آوازیں اور ڈھول باجوں کی پکار سنائی دی۔ ریچھ شاید اتنی قریب آنے والی آوازوں سے بدحواس ہو گیا اور بھاگنے لگا ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ مجھے رائفل چلنے کی آواز سنائی دی شاید میرے تایا نے رائفل داغ دی تھی۔ ریچھ چند قدم چلنے کے بعد ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ رائفل کی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور وہ زمین پر گرا تڑپ رہا تھا۔ تایا کی بروقت آمد سے میری جان بچ گئی تھی جس پر میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

آہستہ آہستہ ریچھ کی غراہٹ کی آوازیں ماند پڑ گئیں میرے تایا کے دوست نے ہانکے کے چند جوانوں کی مدد سے مرے ہوئے ریچھ کی کھال اُتار لی اور دوسرے سامان کے ساتھ لاد دی۔ تایا میری اس بہادری پر بہت خوش تھے۔ اور میں بھی کیونکہ اب میں بھی گاؤں کے لڑکوں کو اپنی بہادری کا قصہ سنا سکتا تھا۔ تایا کے دوست نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا،

"ویل ڈن بچے۔ مگر یاد رکھو شکاری بننے کے لئے صرف جذبے کی نہیں، عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آئندہ شکار کے پیچھے اس طرح اندھا دھند نہ دوڑ پڑنا۔"

"اس لئے میں نے کہا تھا نا کہ بہادر تھوڑے سے بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔" عدیل نے سینہ پھلا کر کہا۔ اور سب ہنس پڑے۔

"انکل! بخشو کا کیا بنا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس غریب کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا اور اس کے بچوں کے وظیفے کا بندوبست کیا گیا ویسے مجھے آج بھی اس کی موت کا بہت رنج ہے۔" انکل نے کہا کاش! وہ ریچھ میرے ہاتھوں انجام تک پہنچتا۔"

جواب: ایک دفعہ کا ذکر ہے

"ہنر کبھی ضائع نہیں ہوتا۔" زندگی میں کہیں نہ کہیں ضرور کام آتا ہے۔

سلام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

رانا فیض، صادق آباد جولائی کا تازہ ترین آنکھ مچولی ہاتھوں میں ہے۔ ٹائیٹل دیکھ کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس بار شمارے میں..... اچھی تحریریں تھیں۔ امید ہے اگست کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ سجا ہوا ملے گا۔ **فوزیہ علوی، پٹارو**۔ رسالہ اس بار بھی جلدی نہیں ملا۔ سرورق پسند نہیں آیا البتہ کہانیاں اچھی تھیں۔ **سارہ حمید، ڈیرہ اسماعیل خان** اس ماہ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ آپ کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے امید ہے۔۔۔؟ ○ نئے مہمانوں کے خط تو ہم پہلے چھاپتے ہیں۔ **طلحہ احمد طاہر، سرگودھا**۔ میں پانچ سال کا تھا تو ہمارے گھر والے برادر اسلامی ملک ترکی شفٹ ہو گئے تھے۔ اب سات سال بعد اپنے وطن پاکستان آیا ہوں تو آنکھ مچولی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند آیا۔ میں ترکی میں یہ رسالہ باقاعدگی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ وہاں بھجوا سکتے ہیں؟ اس کا خرچہ بھی بتا دیجئے؟ ○ طلحہ! آنکھ مچولی آپ کو پسند آیا۔ پسندیدگی کا شکریہ! آپ پانچ سو روپے کا منی آرڈر یا ڈرافٹ آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کر دیجئے۔ آپ کے پیسے ملتے ہی ایک سال تک آپ کو گھر بیٹھے ترکی میں آنکھ مچولی رجسٹرڈ ڈاک سے ملتا رہے گا۔ **سعدیہ یاسمین، راولپنڈی** صرف

کراچی ہی میں نہیں، راولپنڈی، لاہور، جھنگ میں بھی حالات خراب ہیں- یہ ساری آگ تعصب کی بوئی ہوئی ہے- آنکھ مچولی پڑھنے والے اکثر بچے دھمکی بھرے خطوط لکھتے ہیں کہ اگر آپ نے ہماری تحریر شائع نہ کی تو ہم یہ رسالہ نہیں پڑھیں گے یا یہ کہ ہمارا تعلق سرحد، بلوچستان پنجاب سے ہے اس لئے آپ ہماری تحریریں نہیں چھاپتے- یہیں سے تعصب کی ابتدا ہوتی ہے- غصے کے عالم میں بویا گیا نفرت کا بیج جلد ہی تنا آور درخت بن جاتا ہے- خدارا تعصب سے بچیں- سچے مسلمان اور اچھے پاکستانی بنیں!!**سیّد فرحان احمد، حیدر آباد**"ماہ رواں کی پہلی بات" پڑھ کر ہمیں بے حد افسوس ہوا- اللہ سے دعا ہے کہ پورے ملک خصوصاً کراچی اور حیدر آباد کو امن کا گہوارہ بنائے- آمین! نظموں میں "حمد باری تعالیٰ" "مزدور" اور "اداس بستی" پسند آئیں- شمارے کا کاغذ اس بار اچھا نہیں تھا-**عبدالمتین قوی، پسنی (مکران)** تازہ شمارہ پڑھا- سرورق کچھ خاص نہ تھا- مضامین اور کہانیاں پسند آئیں- بنام آنکھ مچولی میں خط شائع کرنے کا شکریہ!**اکرم فدا، گوادر**یہاں ڈاک کا نظام اتنا اچھا نہیں کہ چھ سات دن کے اندر خط آپ کو مل جائے- آپ انعامی مقابلوں کی تاریخ بڑھادیں-**وقاص جاوید، خانیوال** کہانیاں معیاری اور دلچسپ تھیں- قلم دوست بھی پسند آیا-**اعجاز نائک، لاہور** ہر چیز ڈرامائی اور خوبصورت تھی- خوبصورت تحریروں اور شاندار انٹرویو کا سلسلہ کافی اچھا ہے-**کاشف ریاض، لاہور** آپ سے دو شکایت ہیں- ایک یہ کہ آپ کا شمارہ وقت پر نہیں آتا دوسرے اس کی قیمت دن بدن بڑھتی جارہی ہے-**افشاں غفار، کراچی** آنکھ مچولی بہترین رسالہ ہے- پچھلے دنوں اس کا خاص نمبر پڑھا جو اپنی مثال آپ تھا- کہانیوں اور نظموں کا انتخاب بہت اچھا لگا-**رانا محمد شاہد، بوریوالہ**- آپ نہ تو میری تحریریں شائع کرتے ہیں نہ میرے خطوط- یہ میرا آخری خط ہے- آنکھ مچولی ایک میگزین ہے کوئی آکسیجن تو ہے نہیں کہ اس کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا-**سیّد شاہ نواز اشال(؟)** آپ کا رسالہ ہر لحاظ سے پاکستان کا سب سے بہترین رسالہ ہے- سنہرے حروف، ماہ رواں کی پہلی بات، کہانیاں، نظمیں، ادبی تحریریں، جنرل معلومات، کھیل، لطائف سب بے مثال ہیں-

○ .... شکریہ- واقعی ایسا ہی ہے ناں؟**محمد سلیم، سمیع، کراچی** شمارہ بہت دیر سے ملا- کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں-**عامرہ خالق قریشی، ایبٹ آباد** آنکھ مچولی بہت اچھا جارہا ہے- نئے انعامی مقابلے بہت دلچسپ، معلوماتی اور تفریحی ہیں- کہانیوں میں بہت زیادہ پختگی اور نکھار آگیا ہے- نظمیں بھی خوبصورت ہوتی ہیں سب سے خوش آئند بات انعامات میں اضافہ ہے-**میر شاہ مراد(؟)** آپ کا رسالہ بہت اچھا جارہا ہے- آپ اس میں سندھی سلسلہ شروع کردیں تو بہت اچھا ہوگا-**بالاچ بلوچ، پسنی (مکران)** حسب روایت آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ گلدستہ سمیٹے دستیاب ہوا- کہانیاں پسند آئیں- "قلم دوست" خوب تھا-**محمد فہیم طاہری، دادو** آنکھ مچولی کی قیمت دیکھی تو پیروں سے زمین نکل گئی- کافی غصہ آیا مگر اسلام میں غصہ حرام ہے اس لئے اسے پی گئے- ویسے ہمیں احساس ہے کہ کتنی مشکلات اور صبر آزما حالات میں آپ بچوں کا یہ رسالہ نکال رہے ہیں-**رمانہ مظہر،**

فیصل آباد اس بار کہانیاں اچھی تھیں لیکن نظمیں پسند نہیں آئیں۔ **ساجد نور، پسنی (مکران)** آنکھ مچولی شفق، دھنک، مہتاب، ستاروں، نغموں، پھول سبھی سے سجا ہوتا ہے۔ آپ کو جب بھی تحریر بھیجتا ہوں تو کبھی نام کاٹ کر چھاپ دیتے ہیں اور کبھی آدھے سے زیادہ خط کاٹ دیا جاتا ہے۔ ○ --- تقریباً" تمام بچوں کے خطوط چھاپنا بھی مقصود ہوتا ہے اس لئے ہر بچے کے خطوط سے منتخب حصے ہی شائع کئے جاتے ہیں۔ **صائمہ محمد عثمان، کراچی**۔ آنکھ مچولی پڑھا بہت خوشی ہوئی۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ **عرومہ یونس، اسلام آباد** تمام کی تمام تحریریں نہایت خوبصورت اور دلچسپ تھیں۔ سلمان غزالی، نائلہ صدیقی اور محمد عادل منہاج کی تحریریں بہترین ہوتی ہیں۔ **میمونہ عارف، شاہ فیصل کالونی**۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" نیر مسعود صاحب کی تحریر "وہ کیا راز تھا" کے بعد اچھی کوشش تھی۔ پہلی قسط سے لے کر آخری قسط تک دل اس کہانی میں اٹکا رہا۔ **فاطمہ عارف، کراچی**۔ سب کہانیاں نئے انداز پر مبنی تھیں۔ مجھے آنکھ مچولی کے شروع کے ایک سال پر مشتمل شمارے درکار ہیں۔ تفصیل سے بتایئے میں انہیں کس طرح منگواؤں؟ ○ --- 1990ء سے پہلے کے آنکھ مچولی ہمارے ریکارڈ میں مکمل نہیں۔ آپ کو البتہ 1990ء کے بعد کے تمام شمارے ہمارے ریکارڈ میں مل جائیں گے۔

آپ کی تصویر ہم شائع کریں گے مگر

ضروری ہے کہ . . رنگین اور کم از کم پوسٹ کارڈ سائز کی ہو۔

- تصویر کا رنگین ہونا ہی کافی نہیں ... واضح، دلکش اور منفرد ہونا بھی ضروری ہے۔
- تصویر اسٹوڈیو یا گھر کے کسی حصے کے بجائے آؤٹ ڈور ہو۔

تصاویر کے لئے چند دلچسپ موضوع ① رونا یا ہنسنا ② شرارت ③ ایڈونچر ④ اہم مصروفیت ⑤ کسی اہم یا مشہور جگہ پر ⑥ کھیلتے ہوئے یا کوئی بھی دلچسپ موضوع۔

- ناقابلِ اشاعت تصاویر صرف جوابی لفافے کی صورت میں واپس بھجوائی جائیں گی۔
- اپنی تصاویر نام اور پتے کے ساتھ علیحدہ لفافے میں اس پتے پر پوسٹ کریں۔

آنکھ مچولی البم ۔ ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی کراچی نمبر ۵

شبیر بیگ ناز

جنگل کی دُنیا

آزاد پرندے ہیں
آزاد درندے ہیں
کس شان سے رہتے ہیں
جنگل کے یہ بیٹے ہیں

بے خوف اڑانیں ہیں
خوشیوں بھری تانیں ہیں
غم کھانے نہ پینے کا
کیا لطف ہے جینے کا

چھاؤں ہے بڑی میٹھی
سرسبز درختوں کی
پھولوں بھرے رستے ہیں
بہتے ہوئے چشمے ہیں

گیتوں سے بھری صبحیں
خوشبو سے بھری شامیں

منظر ہیں بڑے پیارے
اللہ کی قدرت کے

ہے ناز بڑی پیاری
یہ زندگی جنگل کی

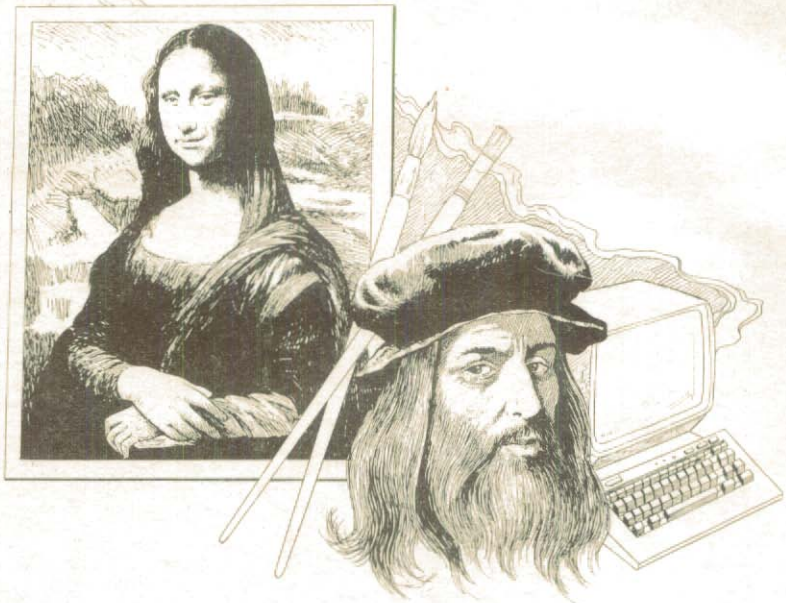

مونالیزا کون تھی

غلام حسین میمن

اکثر آپ نے کسی دوست کے ڈرائنگ روم یا میوزیم میں "شاہکار مونالیزا" کی پینٹنگ دیکھی ہوگی تو یہ سوال ذہن کے پردوں پر ابھرا ہوگا کہ یہ مونالیزا کون تھی.....؟ کہا جاتا ہے کہ حقیقی مونالیزا پوپ لیو کے بھائی جولیانو ڈی میڈی سینی کی شریک حیات تھی لیکن اس کی شہرت کا اصل سہرا عظیم مصور لیوناڈوڈاونسی کے سر ہے۔

مگر سائنس داں اس بات میں شک کا اظہار کررہے تھے اور اس جستجو میں تھے کہ مونالیزا کون تھی؟ کئی صدیوں کے اس سوال کو کمپیوٹر نے حل کردیا اور یہ بتایا کہ مونالیز کوئی نواب زادی نہیں تھی بلکہ لیوناڈوڈاونسی جس نے یہ تصویر بنائی تھی،

اس کا سیلف پورٹریٹ ہے جس میں اس نے داڑھی صاف کرکے اسے نسوانی شکل دے دی ہے۔

نیویارک میں ہونے والے اس انکشاف کو موجودہ صدی میں آرٹ کی دنیا کا سب سے بڑا انکشاف قرار دیا گیا ہے۔ کمپیوٹر میں لیوناڈو ڈاونسی اور مونالیزا کی تصاویر ڈالی گئیں تو کمپیوٹر نے بتایا کہ دونوں تصاویر کی آنکھیں، ناک، رخسار اور ابرو بالکل ایک جیسے ہیں۔

پینٹنگ مونالیزا کا خالق لیونا ڈوڈاونسی بطور مصور مشہور ہوا مگر وہ بیک وقت انجینئر، موسیقار، ماہر تعمیرات، کارٹوگرافر (نقشہ ساز) اور حساب داں بھی تھا۔ اس نے فلکیات، نباتیات، حیوانیات، ارضیات، عضویات اور فلسفے میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔

فلورنس کے قریب ونسی نامی قصبے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جب بارہ برس کا ہوا تو اسے نامور مصور یروشیو کے پاس مصوری سیکھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس نے کچھ ہی عرصے بعد اپنے استاد کو اعلیٰ مہارت اور اپنی بنائی ہوئی تصاویر کی تکنیک اور حسن سے حیرت میں ڈال دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اسے مصوروں کی انجمن میں شامل کرلیا گیا۔ اس بات میں شک نہیں کہ ایک مکھی کے پر سے لے کر زمین کی پیدائش تک کے موضوعات اس کی ذہانت اور فن مصوری کے سامنے محض کھیل کے میدان تھے۔

وہ ماہرانہ انداز میں پتوں، چٹانوں، انسانوں اور مناظر قدرت کی تصاویر بناتا تھا۔ اس نے سائے اور روشنی کی جس انداز سے تشریح کی ہے اسے دوبارہ کسی اور انداز میں پیش کرنا عام انسان کے لئے بہت مشکل ہے۔ مونالیزا کے علاوہ اس کا ایک اور شاہکار "The Last Supper" اس کی فنکارانہ عظمت کا ایک نادر نمونہ ہے۔

اس نے ریاضی اور مصوری کے ملاپ سے یہ انکشاف بھی کیا کہ کسی بھی شخص کے باہر کی جانب پھیلے ہوئے اعضا اس کے قد کے برابر ہوتے ہیں۔ اس دائرے میں پھیلے ہوئے اعضا کا مرکز ناف ہوگی اور ٹانگوں کے درمیانی فاصلے سے مثلث مساوی الاضلاع بنے گی۔

اس کا ہم عصر مصور جیا جیو واساری اس کی تعریف میں لکھتا ہے کہ وہ ایک دراز قد، خوش شکل اور مضبوط انسان تھا۔ وہ ایک اچھا تیغ زن ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر گھڑ سوار بھی تھا۔ ۶۸ برس کی عمر میں اسے اس وقت کا عظیم مصور مانا گیا جس دور میں مائیکل اینجلو، رافیل اور بوٹی سیلی جیسے نامور مصور موجود تھے۔

سوال آدھا جواب آدھا

مرتب: محمد بن مالک

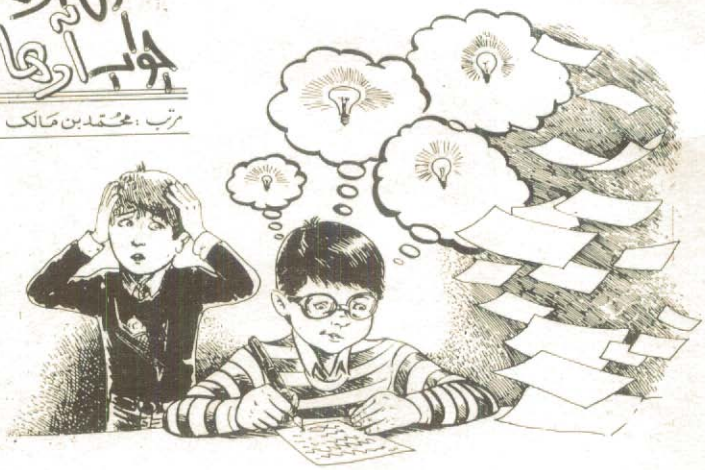

مقابلہ نمبر ۴

۱۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا تھا (جس کو اہل کتاب نہیں مانتے)۔ بتایئے یہودیوں کے عقیدے کے مطابق اللہ نے کس پیغمبر کو آسمان پر اٹھالیا تھا؟

۲۔ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے معمر زوجہ مطہرہ تھیں۔ آپؐ کی سب سے کم عمر زوجہ مطہرہ کون تھیں؟

۳۔ "مثنوی گلزار نسیم" پنڈت دیا شنکر نسیم نے لکھی۔ بتایئے "مثنوی سحرالبیان" کس کی تخلیق ہے؟

۴۔ "یادگار غالب" مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی تھی۔ "یادگار حالی" کس نے لکھی؟

۵۔ بطخیں، عام گھریلو مرغ، کیوی اور شتر مرغ وغیرہ وہ پرندے ہیں جو اڑ نہیں سکتے، محض چل پھر لیتے ہیں وہ کونسا پرندہ ہے جو اڑ سکتا ہے، مگر چل نہیں سکتا؟

۶۔ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا۔ آپ ہندوستان کا یوم آزادی مع سن بتادیجئے؟

۷۔ ایگری کلچر (Agriculture) سے مراد "زراعت" ہے۔ ایوی کلچر (Aviculture) سے مراد کیا ہے؟

۸۔ پاکستان کا سب سے بڑا شہر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کراچی ہے۔ سب سے چھوٹا شہر کونسا ہے؟

۹۔ "بز" کا مطلب تو فی صد ہے "بز" کا کیا مطلب ہے؟

۱۰۔ دنیا کے سب سے کم عمر ٹیسٹ کرکٹر تو پاکستان کے مشتاق محمد ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کے معمر ترین کھلاڑی کونسے ہیں اور ان کا تعلق کس ملک سے ہے؟

مقابلہ نمبر ۲ کے درست جوابات۔

(۱) بی بی سارہ علیہا السلام
(۲) حضرت جعفر طیارؓ بن ابو طالب۔
(۳) بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(۴) عبدالحمید عدمؔ
(۵) گیسوں کی نمی معلوم کرنے کے لئے
(۶) ۱۶۱۷ مربع میل
(۷) بہت تعریف کیا گیا
(۸) عبدالستار خیری عبدالجبار خیری
(۹) بلڈ گروپ "AB"
(۱۰) بل ایڈرچ۔ انگلینڈ۔ ۵۲ چوکے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب۔

(۱) عابد لطیف، خیرپور میرس (۲) فاطمہ چوہان، کروڑپکا (۳) طیب علی، لاہور۔

درست جواب دینے والوں کے نام۔

آمنہ افتخار، لاہور۔ روبینہ انور، لاہور۔ علی افضل، سیالکوٹ۔ شاہدہ حسین، منصور، فوزیہ سرفراز، کراچی۔ عبداللہ میمن، حیدر آباد۔ فیصل امام، کراچی۔ جہانزیب انوڑ پشاور۔ محمد اسحاق منہاس، چکوال۔ شعیب خان، لاہور۔ نعیم احمد سلیم احمد، شمیم احمد، اسلام آباد۔ عامر لطیف، راشد لطیف، ساہیوال۔ محمد ممتاز، رضیہ اختر، ذوالفقار علی، افتخار علی، ملتان۔ منیر احمد فردوس، جہانگیر آباد۔ فیاض احمد فیضی، رحیم یار خان۔ عدنان ارشد، نعمان ارشد، حیدر آباد۔ این کے بلوچ، مکران۔ افضال لہڑی، دلشاد لہڑی، کوئٹہ۔ محمود احمد خان، عبدالستار خان، صغیر حسین، محبوب عالم، دریا خان۔ غلام سرور شیرازی، بھکر۔ فیضیاب علی خان، ارباب علی خان، نوشہرہ۔ نورینہ ارشاد، بہاولپور۔

عربی ادب سے

سلسلے وار ناول

کہانی انسان کی

اسحاق منصوری

ظالم بادشاہ کے ڈر سے ماں نے اپنے بچے حیّ کو ایک صندوق میں بند کر کے سمندر کی لہروں کے حوالے کردیا۔ لہریں صندوق کو جزیرہ واقواق کے گھنے جنگل میں چھوڑ آئیں۔ یہاں ایک ہرنی نے اس بچے کو اپنے گم شدہ بچے کی جگہ پرورش کرنا شروع کیا۔ وہ اسے اپنا دودھ پلاتی، گرمی سردی سے بچاتی، اور پیار و محبت سے چومتی چاٹتی۔ بچہ بھی ہرنی سے بہت پیار کرتا۔ وہ اس کے بغیر تھوڑی دیر بھی نہیں رہتا تھا۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ہر وقت ہرنی کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ اب وہ دودھ کے علاوہ دیگر جنگلی پھل بھی کھانے لگا تھا۔ اس کی دوستی جنگلی گائے کے ایک ریوڑ سے بھی ہوگئی تھی۔ بچہ ہرن اور جنگلی گائے کی آواز کی نقل بھی اتارتا تھا۔ بلکہ وہ جنگل میں موجود تمام جانوروں اور پرندوں کی آوازوں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا۔ خاص طور پر وہ ہرنی کی آوازوں کی زیادہ نقل کرتا تھا۔ مدد کے لئے بلانے کی آواز الگ تھی۔ پیار و محبت کی آواز الگ تھی۔ بھوک اور پیاس کی آواز الگ تھی۔ حیّ تمام جانوروں کی آوازوں اور بولیوں سے مانوس ہو چکا تھا۔ جانور اور پرندے بھی اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ وہ جانوروں اور پرندوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ بعض جانور اور پرندے اچھے لگتے تھے جیسے مور۔ اور بعض پرندے اور جانور اسے اچھے نہیں لگتے تھے جیسے بندر۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

میں اتنا کمزور کیوں ہوں؟

وہ تمام جانوروں پر غور کرتا وہ دیکھتا کہ ان سب کے جسم بالوں اور پروں سے چھپے ہوئے ہیں اور ان کے بالوں اور پروں کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور وہ یہ بھی دیکھتا کہ کچھ جانور بہت تیز رفتار ہیں۔ کچھ جانوروں میں بہت زیادہ طاقت ہے۔ کچھ جانوروں کے دانت اور ان کے پنجے اور ان کے ہاتھوں کے ناخن اور سینگ ان کے لئے ہتھیاروں کا کام دیتے ہیں جن کے ذریعے وہ مقابلے کے وقت اپنی حفاظت کرتے ہیں اور ان ہی ہتھیاروں سے شکار کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے بارے میں سوچتا کہ اس کا جسم اس قسم کے بالوں اور پروں سے خالی ہے جانوروں کی طرح اس کے پاس نوکیلے پنجوں کا ہتھیار بھی نہیں اور وہ ان جیسا تیز رفتار بھی نہیں اور نہ ہی ان جیسی طاقت اس میں موجود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جانور اس پر غالب آجاتے تھے وہ اپنی حفاظت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے ہم عمر جانوروں کے بچوں کو دیکھتا خاص طور پر ہرنی کے بچوں پر غور کرتا کہ ان کے سروں پر سینگ ہیں اور کچھ عرصے بعد یہ بچے اس سے دوڑنے میں بھی تیز ہوگئے ہیں۔ وہ ان سب چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح وہ دیکھتا کہ تمام جانور دم والے ہیں اور اس کی کوئی دم نہیں ہے اسے اس بات پر کبھی حیرت ہوتی اور کبھی افسوس ہوتا۔

پتے سوکھ کر جھڑ جاتے تھے

یہ سب باتیں سوچتے سوچتے وہ تقریباً سات سال کا ہوگیا اسے یہ احساس ہوگیا کہ جانوروں کے پاس جو چیزیں ہیں یعنی بال وپر، دُم اور پنجے ایسی چیزیں اس کے جسم میں اب کبھی بھی پیدا نہیں ہوں گی۔ اس نے لمبے لمبے پتے اپنے آگے اور پیچھے باندھ لئے۔ اور مضبوط اور لمبی گھاس سے پٹی بنا کر اسے اپنی کمر پر باندھ لیا اور اسی پٹی سے اپنے آگے پیچھے اس کے بہت سے پتے لٹکا لئے لیکن یہ پتے تو تھوڑے ہی دنوں کے بعد سوکھنے لگے اور گرنے لگے۔ اب وہ پتوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر چپکا دیتا اور ایک دوسرے کو آپس میں جوڑ دیتا تاکہ اس کا جسم چھپ جائے اور اس طرح شاید پتے زیادہ عرصے تک نہ گریں۔ بہرحال پتے تھوڑے ہی عرصے بعد سوکھنے لگتے اور آخر کار سوکھ کر گر جاتے۔ اسی طرح اس نے درختوں کی ٹہنیاں کاٹیں اور انہیں سیدھا کیا ان لکڑیوں سے وہ اپنے اوپر حملہ کرنے والے درندوں کو بھگاتا اور کچھ جانوروں پر وہ سواری کرتا۔ اس کامیابی سے حنّی بن یقطان کو اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوا اور اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بہت سارے

جانوروں سے افضل و برتر ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ مختلف جانوروں کو کس طرح اپنی خدمت کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اب وہ جانوروں کے پیدائشی ہتھیار یعنی سینگ، پنجوں وغیرہ کے بارے میں زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ اس طرح اب اسے دم کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

پہلا لباس

اسی دوران جب کہ اس کی عمر سات سال کے قریب تھی وہ پتوں کے لباس سے کچھ بیزار ہونے لگا اسے بار بار پتے بدلنے پڑتے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی پرندے کے بازو اور پر کاٹ کر اپنے جسم پر پتوں کے لباس کی جگہ لگالے۔ البتہ حیٰ کو یہ بات عجیب لگی کہ دوسرے جانور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں کے پاس نہیں جاتے بلکہ ان سے دور بھاگتے ہیں یہ سوچ کر وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کچھ دنوں کے بعد ایسا ہوا کہ اس نے ایک باز مرا ہوا دیکھا اور یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ دوسرے جانور اس مردے سے ویسی نفرت نہیں کرتے جیسی اپنے مردوں سے کرتے تھے۔ اس موقع کو اس نے غنیمت سمجھا۔ اس نے مردہ باز کے دونوں بازو کاٹ لئے اور اس کی پوری دم بھی بالکل صحیح سلامت کاٹ لی۔ ایک بازو اس نے اپنے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف باندھ لیا اور پیچھے سے بیچ میں دم لگادی۔ اسی طرح اس کی کھال کے بھی دو حصے کرلئے۔ ایک حصہ اپنے سینے پر لگالیا۔ اور دوسرا پیٹھ پر لگالیا۔ اس طرح اسے ایک لباس مل گیا۔ جس سے اس کے جسم کو حرارت بھی ملتی تھی اور اس کی حفاظت بھی ہوتی تھی۔ اس لباس سے دوسرے جانوروں پر اس کا رعب اور دبدبہ بھی قائم ہوگیا اب کوئی جانور اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اب وہ اس ہرنی کے ساتھ انتہائی سکون اور اطمینان سے رہنے لگا جو اسے دودھ پلاتی تھی اور اس کی پرورش کرتی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ اس ہرنی کی جدائی برداشت کرسکتا تھا اور نہ ہی وہ ہرنی اس کی جدائی برداشت کرسکتی تھی۔ اس طرح امن کی فضا میں وہ دونوں زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ ہرنی بوڑھی ہوگئی اور کمزور ہوگئی۔ اب حیٰ ابن یقطان اس ہرنی کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا اور اسے اچھے اور میٹھے میٹھے پھل کھلاتا۔ وہ اس ہرنی کی ہر طرح سے خدمت کرتا اور اس کا ہر وقت خیال رکھتا کہ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ اس ہرنی نے بچپن میں جس پیار و محبت سے اس کی پرورش کی تھی وہ سب باتیں اسے اچھی طرح یاد تھیں۔

باب دوم : آہ! وہ مرگئی

اب ہرنی دن بہ دن کمزور ہوتی جارہی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی موت کا وقت آگیا ہے۔ آخر ایک دن موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا جس سے کسی کو فرار نہیں۔ اس ہرنی کا جسم حیّ بن یقطان کی آنکھوں کے سامنے بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ جب اس نے ہرنی کو اس حال میں دیکھا تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور قریب تھا کہ رنج والم کے مارے اس کی جان بھی چلی جاتی۔ اس ہرنی کا لقب ام عزہ تھا۔ حیّ ہمیشہ ہرنی کو اسی لقب سے پکارا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے حسب معمول ام عزہ کو آواز دی۔ وہی آواز جیسے سن کر ام عزہ جواب میں ایک عجیب سی آواز گلے سے نکالتی تھی لیکن اسے جواب نہیں ملا۔ اب حیّ نے اپنی پوری طاقت سے آواز نکالی۔ لیکن اب بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے اس کی دُم کو دیکھا اس کی آنکھوں کو دیکھا ہرنی کے جسم کے ایک ایک عضو کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ اسے کہیں بھی کوئی زخم نظر نہ آیا اور نہ کہیں کوئی بیماری نظر آئی۔ حیّ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اسے یہ پتہ چل جائے کہ ہرنی کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ پہلے کی طرح اب کیوں نہیں بولتی۔ اس کے جسم کے کس حصے میں خرابی واقع ہو گئی ہے اور جسم کے کس عضو کو ایسی بیماری لگ گئی ہے کہ اب نہ وہ حرکت کرتی ہے اور نہ بات کرتی ہے حیّ اس جستجو میں لگا ہوا تھا کہ اس خرابی کو دور کروں تاکہ اس مہربان ہرنی کو دوبارہ زندگی مل جائے تاکہ یہ ہرنی پہلے کی طرح کھاتی پیتی اور چلتی پھرتی نظر آئے لیکن حیّ اپنی پوری کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

حیّ سوچ میں ڈوب گیا

حیّ یہ سوچنے لگا کہ جب وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے یا آنکھوں کے سامنے کوئی چیز آجاتی ہے تو جب تک وہ آنکھیں نہ کھولے اور جب تک آنکھوں کے سامنے پڑی ہوئی چیز کو ہٹا نہ دیا جائے۔ وہ کوئی بھی چیز نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح وہ جب اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہے تو اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ اسی طرح وہ جب اپنی ناک کو اپنے ہاتھ سے بند کر دیتا ہے تو اس کو اچھی یا بری کسی بھی قسم کی بو محسوس نہیں ہوتی۔ ان خیالات کی روشنی میں اس نے یہ سوچا کہ اس ہرنی کی دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی قوتوں کے سامنے کوئی رکاوٹ آگئی ہے، جس کی وجہ سے نہ وہ دیکھ سکتی ہے نہ کوئی آواز سن سکتی ہے اور نہ کوئی چیز سونگھ سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس رکاوٹ کو دور کر دیا جائے تو یہ ہرنی دیکھنے، سونگھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔

ہرنی کو زندہ کرنے کی کوشش :

یہ سوچ کر حیّ نے اس ہرنی کے تمام اعضا کا جائزہ لیا اور کافی دیر تک ان کو ٹٹولتا رہا اور تحقیق

میں مشغول رہا لیکن اسے اس کا کوئی ظاہری سبب نظر نہیں آسکا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ہرنی کا ہر عضو ساکن اور بے حرکت ہوچکا ہے تو لازماً اسے کوئی ایسی بیماری لگ گئی ہے جو سارے جسم پر چھاگئی ہے۔

اس نے یہ سوچا کہ اس مہربان اور پیاری ہرنی پر کوئی ایسی بیماری آگئی ہے جو اس کو دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ شاید یہ بیماری اس کے جسم کے اندر کہیں ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ ہرنی کے جسم کے اندر کا کوئی حصہ بے حرکت ہوگیا ہے اور اس وجہ سے پیاری ہرنی بے حرکت ہوچکی تھی۔ جیؔ نے یہ بھی سوچا کہ اس عضو کو میں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا لیکن یہی عضو ہرنی کے جسم کا سب سے اہم جزو ہے اور اسی عضو کی وجہ سے شاید اس کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اور اب اسی عضو پر کوئی مصیبت پڑگئی ہے جس کی وجہ سے اس کا پورا جسم بے کار ہوگیا ہے۔ اگر میں اس عضو کا پتہ چلا لوں اور اس بیماری کو دور کردوں تو ہرنی پھر پہلے کی طرح زندگی گزارنے لگے گی اور اس کے تمام اعضا پہلے کی طرح سے حرکت کرنے لگیں گے۔

زندہ رہنے کا راز

جیؔ اس سے پہلے بہت سے مردہ جانوروں اور پرندوں کے جسم دیکھ چکا تھا کہ ان کے جسموں میں پیٹ، سینے اور ان کے علاوہ کہیں بھی کوئی کھوکھلی جگہ نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ اہم ترین عضو جو ہرنی کی زندگی کا باعث تھا اور جس کی وجہ سے ہرنی کے تمام اعضا حرکت کیا کرتے تھے۔ وہ انہی مقامات میں سے کسی جگہ ہونا چاہئے۔ ران میں، سینے میں یا پیٹ۔ اسے بار بار یہ خیال آتا کہ یہ اہم ترین عضو کسی درمیانی جگہ پر ہونا چاہئے اس کی فطرت اور طبیعت بھی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ ایسا عضو جو تمام جسمانی اعضا کو کنٹرول کرتا ہے۔ انہیں قوت اور طاقت فراہم کرتا ہے وہ لازماً ان سب کے بیچ میں ہونا چاہئے جب جیؔ نے اپنے اوپر غور کیا تو اس نے محسوس کیا کہ کسی عضو کے چلنے کی آواز اس کے سینے میں سے آرہی ہے۔ اس نے یہ سوچا کہ یہی وہ اہم ترین عضو ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ اسی طرح اس نے اپنے دوسرے جسمانی اعضاء کو دیکھا جیسے ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، آنکھ اس نے یہ سوچا کہ ان کے بغیر بھی میں زندہ رہ سکتا ہوں ان میں سے کسی کے ختم ہوجانے سے میری پوری زندگی ختم نہیں ہوجائے گی۔ پھر اس نے دوبارہ سینے سے مسلسل آنے والی انتہائی منظم آواز پر پھر سے غور کیا۔ اسے یہ یقین ہوتا گیا کہ اس عضو کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے

غور کیا کہ جب کبھی اس کا جنگل میں کسی درندے سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ سب سے زیادہ اپنے سینے کو بچانے کی فکر کرتا ہے کیونکہ اس کے دل ودماغ میں یہ خیال بیٹھ چکا تھا کہ یہی عضو زندگی کی بنیاد ہے۔ جب اسے یہ پورا یقین ہوگیا کہ وہ عضو جو اس ہرنی کی زندگی اور موت کا سبب ہے وہ سینے میں چھپا ہوا ہے۔ تو اس نے سینے کو چیرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح تحقیق اور جستجو میں شاید اسے کامیابی نصیب ہوجائے اور وہ اس بیماری کو دور کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ (باقی آئندہ)

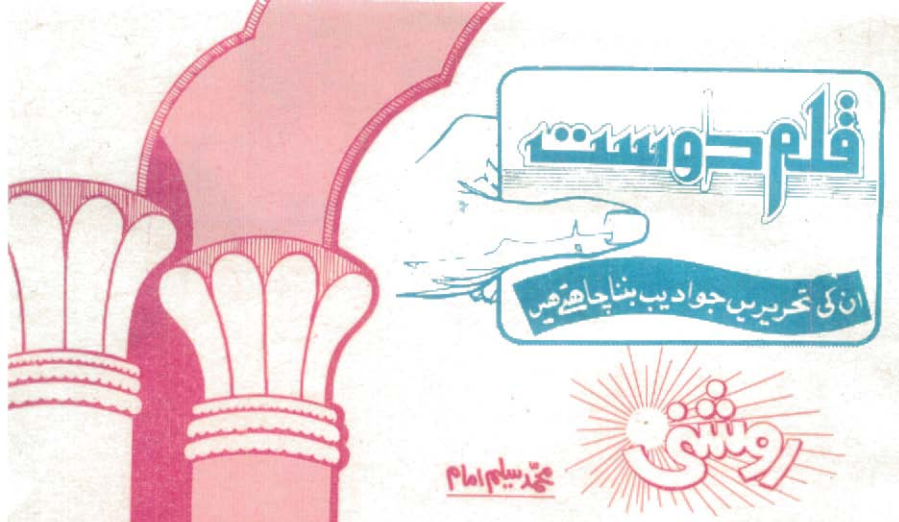

روشنی

محمد سلیم امام

ایک روز حضرت عمرؓ منبر پر چڑھ کر تقریر کر رہے تھے۔ آس پاس ہزاروں کا مجمع تھا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا "اگر میں دنیا کی جانب جھک جاؤں تو تم لوگ کیا کرو گے ۔۔۔۔۔؟" حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ ادا کرتے ہی ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور میان سے تلوار نکالتے ہوئے بولا : اسی تلوار سے تمہیں سیدھا کردوں گا۔" حضرت عمرؓ نے جو خلیفہ وقت تھے، ڈانٹتے ہوئے کہا "تو میری شان میں یہ الفاظ کہہ رہا ہے ۔۔؟"

اس شخص نے جواب دیا : "ہاں! تمہاری شان میں۔" حضرت عمرؓ نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا "الحمدللہ، میری قوم میں ایسے لوگ ہیں کہ اگر میں راہ سے بھٹک جاؤں تو سیدھا کردیں۔"

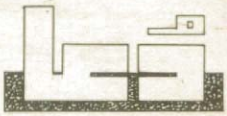

انتخاب : ساجد نور، پسنی مکران

شاعر : بشیر بدر

اس دَر کا دربان بنا دے یا اللہ
مجھ کو بھی سُلطان بنا دے یا اللہ
سہما دل، ٹوٹی کشتی، چڑھتا دریا
ہر مُشکل آسان بنادے یا اللہ
ان آنکھوں سے تیرے نام کی بارش ہو
پتھر ہوں انسان بنادے یا اللہ
میں جب چاہوں جھانک کے تجھ کو دیکھ سکوں
دل کو روشن دان بنادے یا اللہ

یہ وطن تمہارا ہے

کلیم زیدی

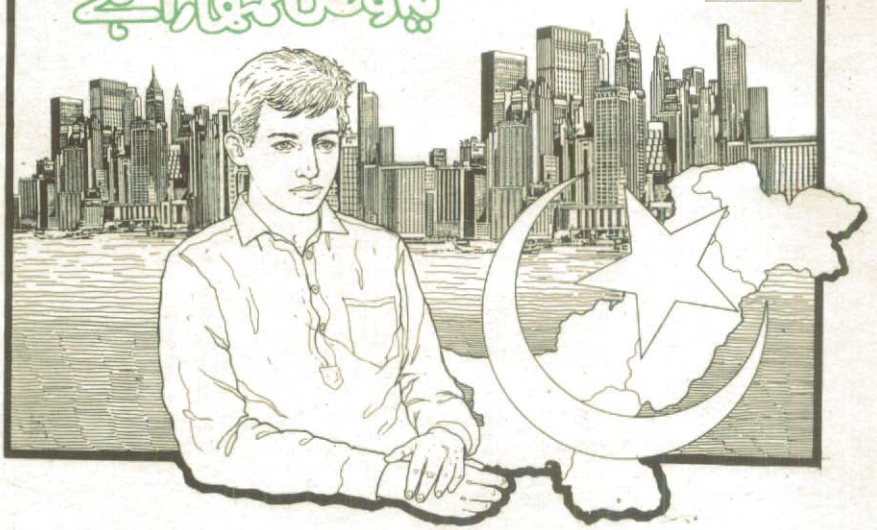

ہمارے بزرگوں کی قربانیوں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت کی وجہ سے ہمیں ایک آزاد ملک مل گیا اب یہ ہمارا فرض تھا کہ اِس ملکِ عالیشان کو ترقی دیتے انصاف، رواداری، سچائی اور مساوات کا بول بالا کرتے۔ اِسے عالمِ اسلام کا قلعہ بناتے لیکن افسوس ہم نے اِس کی بنیادوں کو آپس کے جھگڑوں اپنے مفادات اور خود غرضی کی بنا پر کمزور کر دیا۔ تقریباً نصف صدی گزارنے کے باوجود ہم اِس ملکِ عالیشان کو پاکستان نہ بنا سکے۔۔۔۔!!

اس سال چودہ اگست کو ہم قیام پاکستان کی اڑتالیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ یہ وطنِ عزیز ہمیں بڑی قربانیوں کے بعد ملا ہے اس ملک کے قیام کے لئے لوگوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اپنے لہو سے اس مٹی کو سیراب کیا۔ لاکھوں لوگوں نے اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر اس پاک سرزمین کی طرف ہجرت کی۔ کتنی ہی ماؤں سے ان کے بیٹے چھن گئے، کتنے ہی بچے یتیم ہوگئے۔ یہ سب کیا تھا؟ کس لئے تھا؟؟؟ ان تمام قربانیوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ آنے والی نسلیں اپنے بڑوں کی طرح غلامی کا طوق پہنے..... سسک سسک کر زندگی گزارنے کے بجائے آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی سے سانس لے سکیں۔

بزرگوں کی قربانیوں اور اللہ کی مہربانی کی

بدولت ہمیں ایک آزاد ملک مل گیا۔ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ اس ملکِ عالیشان کو ترقی دیتے۔ سچائی، انصاف، رواداری اور مساوات کو عام کرتے۔ اسے ایسا بے مثال خطہ بناتے جس کا تصور بابائے قوم نے دیا تھا لیکن افسوس ہم نے اس کی بنیادوں کو اپنی خود غرضی کی بنا پر کمزور کردیا۔ تقریباً نصف صدی گزارنے کے بعد بھی ہم پاکستان کو ترقی یافتہ ملک نہ بنا سکے۔

کیا حکمران کیا عوام --- کسی کو بھی وطنِ عزیز کا کوئی خیال نہیں۔ سب اپنی دُھن اور اپنے مفادات کو عزیز رکھتے ہیں، پورا معاشرہ رشوت و سفارش جیسے موذی امراض کا شکار ہے، چوری اور ڈاکے اپنے عروج پر ہیں اور قتل وغارت گری کا ایک بازار گرم ہے انسانی خون صرف چند ٹکوں کی خاطر پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ کیا ہمارے بڑوں نے ایسے ملک کا خواب دیکھا تھا؟ بقول شاعر

کیا اسی لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

نہیں ہرگز نہیں --- بلکہ انہوں نے ایک پاک سرزمین کا خواب دیکھا تھا امن و آشتی کی سرزمین کا خواب۔ لیکن ہم نے اس ملک کی قدر نہ کی شاید اس لئے کہ ہمیں اتنی حسین و جمیل جنت ارضی بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے، بیٹھے بٹھائے ورثے میں ملی ہے۔ ہمیں غلامی کا مفہوم نہیں معلوم، اس لئے ہم اس آزاد سرزمین کی قدر نہ کرسکے۔

اگر آزادی کی قدر جاننی ہو تو غلامی میں جکڑی ہوئی قوموں کو دیکھیں، کشمیر کو دیکھیں، بوسنیا کو دیکھیں، فلسطین کو دیکھیں، چیچنیا پر نظریں دوڑائیں کہ ہمارے وہ بھائی کس طرح اپنی جانیں قربان کررہے ہیں۔ کس لئے؟ آزادی کے لئے۔

ہمیں یہ بات جان لینی چاہئے کہ آزادی جیسی دولت اتنے آرام سے نہیں ملتی۔ اس کے حصول کے لئے مشکلات کے پہاڑ اور دکھوں کے سمندر عبور کرنا ہوتے ہیں۔ بقول صہبا اختر ؎

صبحِ آزادی کا سورج بھیک میں ملتا نہیں

آزادی کی حفاظت کرنے اور ملک کو ترقی یافتہ بنانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہر فرد اپنے فرائض پوری دیانت داری سے ادا کرے اور ساتھ ہی دوسروں کے حقوق انصاف سے ادا کرے۔

آیئے! اس چودہ اگست کے دن ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ اس مملکت خداداد کی ترقی و خوشحالی کے لئے انتھک محنت کریں گے۔ رواداری، انصاف، مساوات، محبت، اخوت کو عام کریں گے۔ آپس میں برسرِ پیکار نہیں ہوں گے اور اپنی آزادی کی حفاظت اتفاق اور یک جہتی کے ہتھیار سے کریں گے اللہ ہمارا حامی وناصر ہو!!

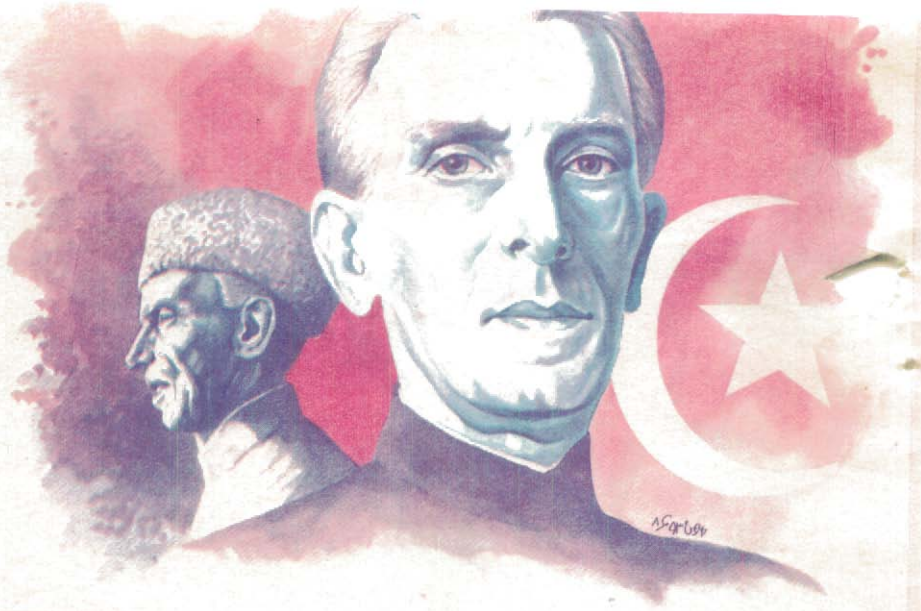

قائد کی یاد میں

ذکی شان احمد

شگفتہ گلوں کا چمن دے گیا
خدا اس کو بخشے وطن دے گیا

غلامی میں تھے موت سے ہمکنار
ہمیں زندگی کا ہنر دے گیا

نہ بڑھنے کا باقی رہا حوصلہ
وہ ہندو کو ایسا سبق دے گیا

وہ تنظیم، ایمان اور اتحاد
یہی چند حروفِ سخن دے گیا

بچیں کیسے دشمن کی چالوں سے ہم
شریفانہ اندازِ فن دے گیا

بڑھیں کیوں نہ ہم رجز پڑھتے ہوئے
اثرات خیبر شکن دے گیا

وہ جاتے ہوئے شان کو تحفتاً
مہکتا ہوا یہ چمن دے گیا

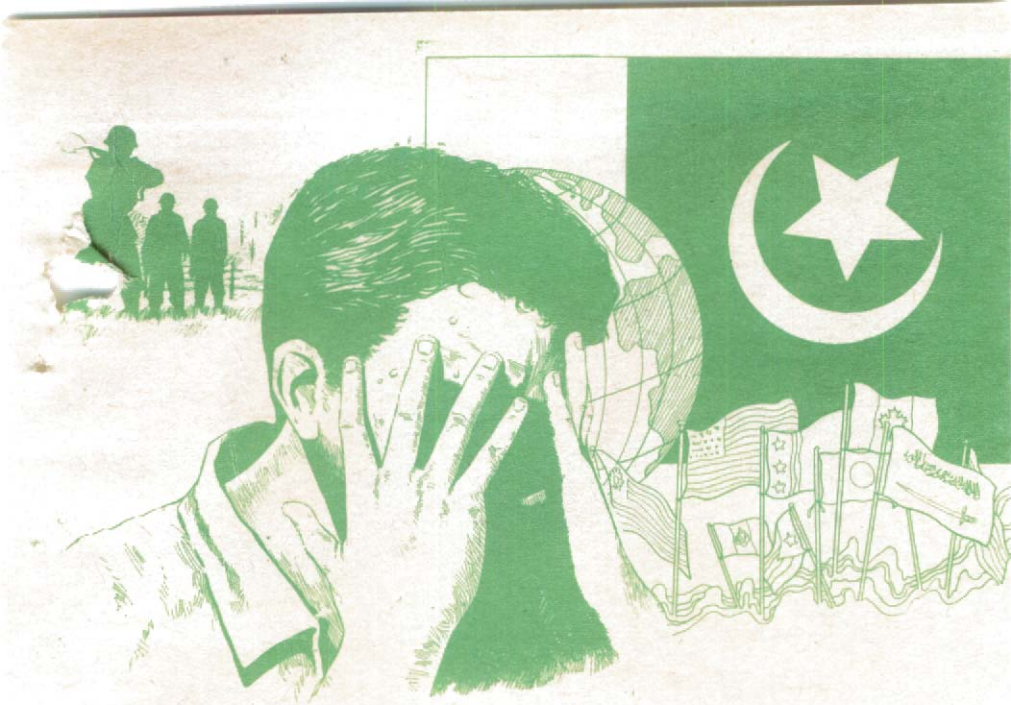

کہانی مقابلے کی پہلی انعام یافتہ کہانی

مکافاتِ عمل

خیرالنسا شیخ

مسلسل تین دن کی ہڑتال کے بعد شاکر دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ کافی لوگ اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ گاڑیاں چلنے لگی تھیں اور زندگی کی رونقیں جو تین کے لئے کہیں گم ہوگئی تھیں، تین دن میں تیس انسانی جسموں کی بھینٹ کے بعد واپس لوٹ آئی تھیں۔

شاکر بس اسٹاپ پر آنے کے بعد بس کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے لرز اُٹھی۔ تین چار یلو کیب بڑی تیزی سے اسٹاپ پر آکر رُکیں۔ اور ان میں سے ڈھاٹا بردار کچھ لوگ اُتر آئے انہوں نے ہوائی فائرنگ شروع کی تو لوگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ ہڑبونگ کے عالم میں جدھر منہ سمایا بھاگ نکلے۔ ڈھاٹا برداروں

نے گاڑیاں رکوا کر لوگوں سے خالی کرانا شروع کیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خالی گاڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ اوپر جاتا ہوا کالا کالا دھواں، شعلے، گولیوں کی تڑتڑاہٹ، عفریتوں کی طرح لہراتے سائے۔۔۔ شاکر نے یہ سارا منظر پلک جھپکتے میں دیکھا۔ وہ اور لوگوں کی طرح بھاگ نہیں سکا تھا۔ بھاگتا... کیسے؟ اس کی ٹانگ میں پولیو تھا۔ گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو وہ اسٹاپ پر بنے پان کے کیبن کے پیچھے ہو گیا۔

اسی وقت ڈھاٹا برداروں میں سے کسی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاٹا بردار پیلی گاڑیوں میں بیٹھ کر بھاگنے لگے۔۔۔ زن زن کی آوازیں آئیں۔ شاکر نے کیبن کی آڑ سے دیکھا۔ آٹھ دس ڈاٹسن گاڑیاں وہاں آکر رک گئیں ان میں سے قانون نافذ کرنے والے جوان جدید اسلحہ اُٹھائے نیچے اُتر آئے۔ جیسے ہی وہ نیچے اُترے، بائیں طرف بنی بلڈنگ سے ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ جوانوں نے گاڑیوں کی آڑ میں پوزیشن سنبھالی اور فائرنگ کا جواب فائرنگ کی صورت میں دینا شروع کر دیا۔

اس نے ایک بار پھر کیبن کے پیچھے سے گردن باہر نکالی اسی وقت ایک گولی چیختی چلاتی پان کے کیبن کو پھاڑتی اس کے سر میں آکر لگی اور پیشانی کو رگڑتی ہوئی کہیں دور نکل گئی۔ خون کا ایک فوارہ سا اس کی پیشانی سے پھوٹ پڑا۔ وہ ایک دھماکے سے نیچے گرا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔۔۔۔ جب ہوش آیا تو وہ ہسپتال کے بیڈ پر تھا اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں ڈرپ چڑھی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی اس کے سرہانے بینچ پر بیٹھا تھا۔

"خدا کا شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔" اسے ہوش میں آتا دیکھ کر بھائی اس کے قریب کھسک آیا۔

"بڑے خراب حالات ہو گئے ہیں۔ ہمارے علاقے کا بھی محاصرہ ہو گیا ہے۔" اس کے بھائی نے اسے بتایا۔ اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ بھائی کی بات سن کر سر کا درد مزید بڑھ گیا۔

"پچپن افراد پکڑے گئے ہیں۔" بھائی نے بتایا۔

"وہ۔۔۔۔ وہ دہشت گرد بھی جنہوں نے گاڑیوں کو آگ لگائی تھی وہ بھی پکڑے گئے ہیں۔ ناں؟" "نہیں!" بھائی نے کہا..... "تو کیا پھر بے گناہ لوگوں کو پکڑنے کے لئے محاصرہ کیا گیا ہے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ کون دہشت گرد ہے اور کون معصوم؟" وہ پھٹ پڑا۔ اس کی یہ بات سن کر ایک بڑے صاحب اس کے قریب آگئے۔ وہ اپنے کسی عزیز سے ملنے آئے ہوئے تھے جن کی ٹانگ اور پیٹ میں گولیاں لگی تھیں اور انہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا تھا۔

"پاکستان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ کس طرح اسے خطرے سے باہر نکالا جائے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کیا بنے گا پاکستان کا؟" ان بڑے صاحب نے افسوس سے کہا۔ شاکر ان کی یہ بات سن کر لرز اُٹھا۔ اسے پاکستان سے بڑی محبت تھی اور جب سے پاکستان کے دل کراچی کے حالات خراب ہوئے تھے۔ اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔

"پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے بڑے صاحب۔ اس پر قرآن کا سایہ ہے۔"

اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"سنا ہے محاصروں کے ذریعے دہشت گرد پکڑ لئے جائیں گے اور پھر چین وسکون ہوجائے گا۔" بڑے صاحب نے کہا۔

"ہونہہ!.... چین وسکون - - - - بے گناہوں کے محاصرے سے کبھی چین وسکون حاصل نہیں ہوگا۔ محاصرہ کرنا ہے تو سب سے پہلے "بڑوں کا محاصرہ" کرنا ہوگا جن کی ڈوریں کہیں اور سے ہلتی ہیں لیکن کون ان کا محاصرہ کرے گا سب "ان" سے ڈرتے ہیں - - - محاصرہ کرنا ہے تو ہم سب کو اپنا محاصرہ کرنا ہوگا - - - - اپنا احتساب کرنا ہوگا۔ اپنی خامیوں' کوتاہیوں' غلطیوں کو دیکھنا ہوگا - - - - اپنے اندر پیدا ہونے والی برائیوں کو ختم کرنا ہوگا۔ جس دن ہم نے اپنا محاصرہ کرلیا اسی دن امن ہوجائے گا' سکون ہوجائے گا اور معاشرے میں پھیلی ہوئی گندگیاں دور ہوجائیں گی۔"

شاکر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہسپتال میں گولیاں چلنے لگیں۔

"تڑ تڑ تڑ - - - تڑ تڑ تڑ - - - - تڑ تڑ تڑ - - -

مریضوں میں چیخوں وپکار مچ گئی لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ وارڈ بوائے نے باہر سے آکر بتایا۔

ہسپتال کا بھی محاصرہ ہوگیا ہے۔ دو مجرم ہسپتال میں علاج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ انہیں پکڑنا ہے ان کے اور بھی ساتھی ہسپتال میں ہیں۔ تمام مریض دوسرے وارڈ میں چلے جائیں تاکہ مجرم پکڑے جاسکیں۔"

"مجرم اس وقت تک نہیں پکڑے جائیں گے جب تک ہم اپنے اندر چھپے ہوئے "مجرم" کا محاصرہ نہیں کریں گے، امن وسکون قائم کرنا ہے تو آؤ پہلے اسے پکڑیں!!" شاکر نے چلا کر کہا تو سب اسے حیرانی سے دیکھنے لگے جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو!!

وطن سے محبت کا اظہار ۔ عقیل مختار

اعلان کے ختم ہوتے ہی دبلا پتلا سا سانولے رنگ کا ایک بچہ آہستہ سے اپنی سیٹ سے اُٹھا اور پُر اعتماد انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا اسٹیج پر آیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک ہے، روشن چہرے سے اعتماد جھلک رہا ہے۔

"میرے وطن --- میرے وطن
تیری جنت میں آئیں گے اک دن
ستم شعاروں سے تجھ کو چھڑائیں گے اک دن"

اس کی پُرسوز اور دل میں اُتر جانے والی آواز وادیٔ کشمیر لے جاتی ہے جہاں مسلمانانِ ہند پر ظلم و ستم کا بازار گرم ہے، اس کا نغمہ جہاد کا پیغام ہے جو لہو گرما رہا ہے۔ نوجوان ادیبوں کا قلم اس کے

میرا وطن رنگوں کا چمن

ملاقات: آنکھ مچولی

پاکستان اور ملّتِ اسلامیہ کی محبت سے سرشار..... پاک وطن کی فضاؤں میں ملّی نغمے، ترانے اور جذبہ کلمات کا رنگ بکھیرنے والے خوبصورت آواز کے مالک، پُرجوش مجاہد، ننھے ہونہار... عقیل مختار

۲۶ جون صبح کا ذکر ہے، اسلام آباد فیصل مسجد کے..... لیکچر ہال میں ملک بھر کے منتخب نوجوان ادیب تربیتی نشست کے لئے مدعو ہیں۔ لیکچر ختم ہوا تو اعلان ہوتا ہے "اور اب ملّی نغمہ پیش کرنے آرہے ہیں ننھے منے ہونہار --- عقیل مختار!!"

جذبے کے آگے کانپ رہا ہے۔

نغمہ ختم ہوا لیکن اس کی بازگشت اب تک کانوں میں گونج رہی ہے..... ادیبوں کی طرف سے مزید نغموں کی فرمائش ہوتی ہے اور عقیل مختار یکے بعد دیگرے "میرا وطن رنگوں کا

عقیل مختار ——— اپنے انعامات کے ساتھ

چمن" "میرا وطن خوشبو کا بدن" سُنا کر دلوں میں اپنے پرجوش جذبے کو منتقل کر دیتے ہیں۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد ہمیں عقیل کی تلاش ہے ہم چاہتے ہیں کہ ننھا منا یہ مجاہد آنکھ مچولی کے قارئین کو شرفِ ملاقات بخشے..... لیجئے عقیل ہاتھ آگئے ان سے خوب ساری باتیں

پندرہ سالہ ہونہار --- عقیل مختار فیڈرل گورنمنٹ ماڈل اسکول فار بوائز اسلام آباد میں دہم جماعت کے طالب علم ہیں۔ ہماری ان سے پہلی ملاقات تو لیکچر ہال میں ہوئی لیکن اصل بات چیت ۳۰ جون کو ان گھر واقع آئی ٹین ٹو اسلام آباد میں ہوئی جو قارئین آنکھ مچولی کی خدمت میں

مجھے یاد ہے پہلا ملّی نغمہ پڑھتے وقت میرے دل جذبات عجیب سے تھے۔ آواز تو نہیں البتہ آنکھیں ضرور کانپ رہی تھیں.....!!

ہوئیں اور ہمیں اندازہ ہوا کہ عقیل ہمارے نوجوانوں سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے وطن کے نوجوانوں کیلئے..... تو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

پیش کر رہے ہیں۔

س : عقیل! یہ ملّی نغمے، ترانے اور نعتیں پڑھنے کا شوق کس طرح سے ہوا؟

عقیل : انسان چیزوں کو دیکھتا... اور سیکھتا ہے خصوصاً" اپنے بڑوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔

میری بڑی باجی کو بھی اللہ تعالیٰ نے خوبصورت آواز عطا کی ہے۔ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور ملّی نغمے اور ترانے پڑھنے کا شوق باجی کو دیکھ کر ہی ہوا۔

س : اچھا جی! یہ تو ہمیں پتا چل گیا کہ آپ کو یہ شوق کس طرح ہوا اب آپ یہ بتایئے آپ نے پہلا ملی نغمہ یا ترانہ کب اور کہاں پڑھا؟

عقیل : میں نے پہلا ملّی نغمہ اپنے اسکول میں پڑھا تھا اس وقت میں پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔

س : آپ کو اس نغمے کے بول یاد ہیں جو آپ نے اس وقت پڑھا؟

عقیل : (سوچتے اور کچھ مُسکراتے ہوئے) ٹھیک سے یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس ملّی نغمے کو پڑھنے کے دوران میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

س : مائیک پر آکر تو بڑے بڑوں کی کپکپی چھوٹ جاتی ہے اور پہلی دفعہ تو ایسا ہی ہوتا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ مائیک پر پہلی بار جب ہم نے نعت پڑھی تھی تو ہماری ٹانگوں کے ساتھ ساتھ آواز بھی کانپ رہی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی پہلی ہی نعت پر پہلا انعام مل گیا تھا' آپ کو بھی...!!

عقیل : (بات کاٹتے ہوئے کچھ شوخ لہجے میں) یقیناً" جیوری میں آپ کے کوئی "جاننے" والے

ع توشاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے آگے آسماں اور بھی ہیں

ہوں گے!!

س : جیوری میں جو لوگ تھے انہیں تو ہم خود نہیں جانتے تھے ویسے آپ بتائیں جیوری میں آپ کے جاننے والے تو نہیں ہوتے؟

عقیل : (ہنستے ہوئے) ایسا نہیں ہے۔

س : اچھا یہ بتایئے اب تک کتنے مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں اور اب تک کتنے انعامات جیتے ہیں؟

عقیل : پہلی بات تو یہ ہے میں انعامات جیتنے کے لئے یہ سب کچھ نہیں کرتا۔ بس ایک شوق ہے ایک جذبہ ہے میرے اندر --- وطن سے اور اُمّت مسلمہ سے محبت کا' یہی پیغام میں ملّی نغموں اور ترانوں میں لوگوں تک پہنچاتا ہوں۔ لوگوں تک یہ پیغام پہنچ جائے تو یہی میرے لئے

سب سے بڑا انعام ہے۔

س : عقیل! آپ کے جذبے کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ لیکن آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں ---۔ تھوڑی سی تفصیل تو بتایئے انعامات کی؟

عقیل : آپ بھی پوچھ کر ہی چھوڑیں گے۔ (سوچتے ہوئے) چھوٹے موٹے مقابلوں کا تو مجھے علم نہیں بہرحال اب تک جتنے بھی مقابلوں میں حصہ لیا انعام حصے میں ضرور آیا ہے۔ (پھر کسرِنفسی)

س : ملی نغموں، ترانوں اور نعتوں کا تعلق شاعری سے بھی ہے۔ شاعری میں کون سے شاعر آپ کو اچھے لگتے ہیں۔؟

عقیل : علامہ اقبالؒ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری تمام مسلمانوں کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں اللہ اور اس کے محبوب رسولؐ کا پیغام پوشیدہ ہے۔ وہ نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ نوجوانوں کو وہ مثبت سرگرمیوں کی ترغیب دیتے ہیں ان کا کہنا ہے :

؎ محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

لیکن آج کل کے نوجوان ناچ گانوں پر کمند ڈال رہے ہیں۔

س : تو اس کا مطلب ہے ناچ گانے نہیں ہونے چاہئیں؟

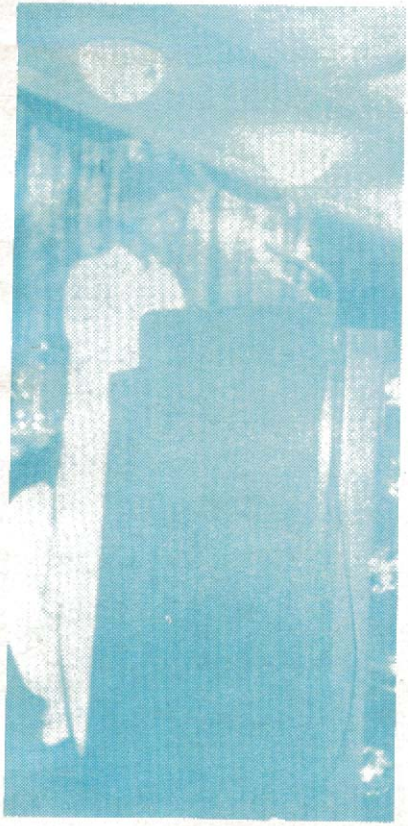

عقیل مختار کشمیر پر ملی نغمہ پیش کرتے ہوئے

عقیل : اسلام میں ایسی چیزوں سے منع کیا گیا ہے جو معاشرے میں بگاڑ پیدا کریں یہاں تو لڑکے لڑکیاں مل کر ناچتے اور گاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا تو شیوہ نہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ان کی نقل کرتے ہیں۔ اسلام میں میوزک سے منع کیا گیا ہے۔

س : ہم تو سمجھ رہے تھے ملّی نغمے گنگناتے گنگناتے ایک دن آپ بھی گانوں کی طرف نکل جائیں گے لیکن آپ تو؟

عقیل : اسلام گنگنانے سے منع نہیں کرتا۔ وہ تو بے حیائی اور برے کاموں سے منع کرتا ہے۔ معاشرے میں بگاڑ کا ایسا کوئی بھی راستہ جو ادھر جاتا ہو اس پر ہرگز نہیں چلنا چاہئے۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو پہلے انڈین فلموں کے ذریعے اور اب ڈش انٹینا' زی ٹی وی او دوسرے چینلز کے ذریعے گمراہ کیا جارہا ہے۔ نوجوان خود کو بُرائیوں سے بچائیں۔

س : آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اللہ تمام مسلمانوں کو بُرائیوں سے بچائے اب آپ یہ بتائیے کہ ملّی نغموں اور ترانوں میں کن کن لوگوں نے آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی؟

عقیل : میرے گھر کے افراد.... جن میں باجی اور میرے بڑے بھائی سرفہرست ہیں پھر اسکول کے استادوں نے میری بہت رہنمائی کی۔

س : اس فیلڈ میں کن کن پڑھنے والوں سے آپ مُتاثر ہیں؟

عقیل : ماشاء اللہ سے کافی سارے لوگ ہیں اس فیلڈ میں لیکن مجھے سلیم ناز بریلوی کی آواز اور ان کے جذبے نے بہت مُتاثر کیا۔ انہوں نے اپنی آواز امتِ مُسلمہ کے لئے وقف کردی ہے۔

س : تو آپ بھی اپنی آواز---؟

عقیل : بالکل جی--- میری آواز ہی کیا--- میرا دل' میری جان سب پاکستان اور امتِ مسلمہ کے لئے ہے۔

س : آپ واقعی سچے مسلمان ہیں اچھا یہ بتائیے ملی نغموں میں کون کون سے نغمے آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

عقیل : "میرے وطن میرے وطن" "وطن کی مٹی گواہ رہنا" "میرا وطن رنگوں کا چمن" "میرے وطن تری جنت میں آئیں گے اک دن" میرے پسندیدہ ملّی نغمے ہیں جو نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

س : ماشاء اللہ سے آپ کی آواز بہت اچھی ہے تو کبھی فخر ہوا آپ کو اپنی آواز پر؟

عقیل : دیکھیں جی! انسان میں کوئی بھی صلاحیت اس کی اپنی نہیں۔ یہ تو اللہ کی دی ہوئی ہے پھر اللہ کی دی ہوئی چیزوں پر فخر نہیں بلکہ شکر کرنا چاہئے۔ اللہ شکر کرنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے اِترانے والوں کو ہرگز نہیں۔

س : عقیل! اگر آپ سے آپ کی یہ صلاحیت چھن جائے تو کیا احساسات ہوں گے آپ کے؟

عقیل : اللہ نہ کرے ایسا ہو اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو میں اسے اللہ کا امتحان سمجھ کر قبول کرلوں گا کہ اللہ کے بندے ہر حال میں اس کا صبر و شکر

کرتے ہیں۔

س : واہ بھئی! یہ تو آپ نے بہت اچھی بات بتائی اب یہ بتائے کہ ملّی نغموں اور ترانوں کی تیاری کے دوران آپ کی پڑھائی تو مُتاثر نہیں ہوتی اور یہ کہ پڑھائی لکھائی میں کیسے ہیں آپ؟

عقیل : انسان اپنی زندگی میں ایک ترتیب اور نظم وضبط کی عادت ڈال لے تو کبھی اس کے معاملات گڑ بڑ نہیں ہوتے۔ الحمد للہ پڑھائی لکھائی میں بھی اللہ تعالیٰ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

س : آپ کا پسندیدہ مضمون---؟ اور یہ بھی بتائیے کیوں پسند ہے؟

عقیل : اسلامیات میرا پسندیدہ مضمون ہے اور یہ اس لئے اچھا لگتا ہے کہ اچھے کام کرنے کا درس دیتا اور بُرائیوں سے لڑنے کا سبق سکھاتا ہے۔

س : تو آپ لڑیں گے بُرائیوں سے؟

عقیل : بالکل جی! میں ہی کیا ہم سب کو بُرائیوں کے خلاف مل جل کر لڑنا چاہئے تاکہ ہمارے وطن سے برائیاں بالکل ختم ہوجائیں اور ہم ایک صاف ستھرے، روشن معاشرے میں اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقوں پر زندگی بسر کرسکیں۔

س : اللہ کرے ایسا ہی ہو ہمارا وطن خوشبوؤں، محبتوں، نیکیوں اور امن کا گہوارہ بن جائے اور اس کے لوگ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیغام پر عمل پیرا ہوجائیں۔ آپ یہ بتائیے اس فیلڈ میں آگے جانے کا ارادہ ہے یا پڑھ لکھ کر کچھ اور کریں گے ؟

عقیل : الحمد للہ! اس فیلڈ میں آگے جانے کا ارادہ بھی ہے اور پڑھ لکھ کر اچھا انسان بننے کے ارادے بھی - - - - آپ بھی میرے لئے دُعا کیجئے!

س : ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ھیں.....

..... اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے نیک ارادوں میں کامیاب کریں اور ملک کے تمام بچوں اور نوجوانوں کو آپ جیسا بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ملک کے بچوں اور نوجوانوں کو کیا پیغام دیں گے آپ؟

عقیل : غیروں کے پیچھے نہ چلیں سچے راستے پر چلیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ میں جو تعمیری صلاحیتیں چھُپا رکھی ہیں انہیں پہچانیں۔ انہیں باہر نکالیں۔ ہمارے ملک کو اور پوری اُمّتِ مُسلمہ کو اس کی اشد ضرورت ہے!!

معلومات پاکستان

- پاکستان کا سب سے قدیم غیر آباد شہر موہنجو دڑو ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا عجائب گھر کراچی میں ہے۔ فیصل رفیق فرخ، مالنہرہ

جیوے پاکستان ہمارا

طاہر ناز انصاری

جیوے پاکستان ہمارا
نام ہے اس کا کتنا پیارا
پاکستان کی کرنا خدمت
اس میں ہے تم سب کی عظمت
اوّل ہے یہ فرض ہمارا
پاکستان کو رکھیں پیارا

جیوے پاکستان ہمارا
ہم سب کی آنکھوں کا تارا

موت کی آواز

جام نذیر حسین

ایک دھماکے کے ساتھ میری کشتی الٹ گئی اور میں پانی میں گر پڑا۔ خونی بھنور کا چکراتا ہوا بے رحم پانی کشتی کو اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ کشتی بے بسی کی صورت بھنور کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ بھنور مجھے بھی اپنی طرف کھینچ رہا تھا... موت مجھے آواز دے رہی تھی لیکن میں نے اس سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا.....!!

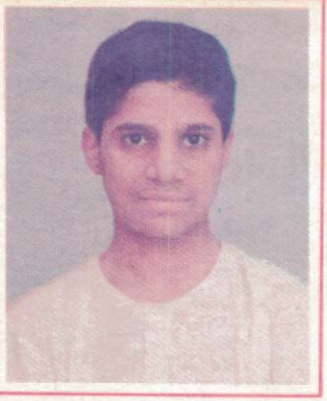

جام نذیر حسین کی اس سنسنی خیز دلچسپ کہانی کو بچوں ہی کے ایک مصنف نے لکھا ہے.... کوئی خاص کہانی تو وہ نہیں لکھتے لیکن پھر بھی ان کی اکثر کہانیاں آنکھ مچولی میں چھپتی رہتی ہیں۔(شائد ان کی ایڈیٹر صاحب سے جان پہچان ہے)

آپ نے ان کا نام بُوجھنا ہے۔ بالکل درست نام بوجھنے والے چھ ساتھیوں میں آنکھ مچولی کے تازہ شمارے رجسٹرڈ ڈاک روانہ کئے جائیں گے۔ اپنے جوابات اپنے مکمل پتے کے ساتھ قلم دوست "ادیب بتایئے انعام پایئے" کی معرفت ارسال کیجئے۔ جوابات ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ہے۔

موسم بالکل موافق تھا۔ ہلکی ہلکی سی ہوا میرے دائیں سے بائیں چل رہی تھی۔ میں کشتی کھیتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ جزیرے سے فرار ہونے میں اس کشتی نے میری بڑی مدد کی تھی۔ بھاگتے وقت میں نے وہ نقشہ بھی اُڑا لیا تھا جس میں جزیرے سے باہر جانے والے راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ جن لوگوں نے مجھے اغوا

سوداگر" کے نام سے پُکارا جاتا تھا۔ مجھے اغوا کرکے اس دور آباد جزیرے میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں تشدد کے ذریعے مجھ سے وہ راز معلوم کرنا چاہتے تھے جو میرے سینے میں محفوظ تھا۔

کیا وہ راز انہوں نے مجھ سے معلوم کرلیا تھا.....؟ کیا انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی تھی.....؟؟ ہرگز نہیں.....! ملکی سلامتی کے اس راز کو تشدد کا کوئی بھی راستہ اور حربہ مجھ سے

اگلوا نہیں سکا تھا۔ بھنور کی لہروں نے مجھے اپنی طرف گھسیٹنے کی بڑی کوشش کی لیکن میری ہمت مجھے موت کی ان خونی لہروں سے دور لے گئی۔ دور ہوتے ہوئے میں نے دیکھا نیلے نیلے پانی میں ساحل پر لگے درختوں کے ٹوٹے پتے تیر رہے تھے اور ایک ٹوٹا ہوا درخت بھنور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری کشتی اب مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ بھنور اسے نگل چکا ہوگا اور اب ٹوٹے ہوئے درخت کی باری تھی۔ "لیکن بھنور اس ٹوٹے ہوئے درخت کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔" میں نے سوچا "وہ ڈوب کر بھی دوبارہ سطح پر اُبھر آئے گا۔" "ہاں! تم اگر اس کا شکار ہو جاتے تو پھر تمہارا سطح آب پر آنا ناممکن تھا۔" میں نے جیسے خود سے کہا اور ہاتھ پاؤں مارتا ہوا ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ --- ساحل کچھ ہی دور نظر آرہا تھا۔ میں نے ابھی کچھ ہی ہاتھ پاؤں چلائے تھے کہ پانی میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ "اف میرے خدا!" میں لرز کر رہ گیا۔ وہ نیلے رنگ کی ایک شارک مچھلی تھی۔ "اس جھیل میں شارک ------ بھنور سے بچے تو اب شارک کے منہ میں؟" اسی وقت شارک نے دو چکر کاٹے اور پھر بڑی تیزی سے میری طرف لپکی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بڑی آسانی سے خود کو اس شارک کے حوالے کر دیتا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا --- میں بزدل کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے مرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے بڑی تیزی کے ساتھ پانی کے اندر ایک غوط لگایا اور نوے درجے کا زاویہ بناتے ہوئے اپنی پنڈلی میں اڑسا ہوا وہ خنجر نکال لیا جو مجھے اغوا کرنے والوں کے ٹھکانے سے ملا تھا اور جسے میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ شائد کبھی کام آئے اور وہ اب کام آنے والا تھا۔

شارک بڑی تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوئی اور میں نے اتنی ہی تیزی سے ایک طرف جھکائی دیتے ہوئے اس کا داہنا حصہ خنجر سے بُری طرح زخمی کر دیا۔ زخمی ہو کر شارک اور زیادہ غضب ناک ہو گئی۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بار پھر وہ میرے قریب آئی اور بڑا بھرپور حملہ کیا میں نے سیکنڈوں کے حساب میں اس کا منہ کھلتے اور نوکیلے دانتوں کی قطار کو دیکھا پھر بڑی پھرتی --- اور ہوشیاری سے اس حملے سے خود کو بچاتے ہوئے اس کا بایاں حصہ بھی بُری طرح زخمی کر دیا۔ خون اس کے جسم سے جیسے اُبل پڑا۔ میں نے زخمی شارک کو پانی کی نچلے حصے میں جاتے اور اس کے پیچھے بننے والی خونی لکیر کو بل کھاتے ہوئے دیکھا پھر بڑی تیزی سے اپنے جسم کو اُچھالا دیتے ہوئے خود کو پانی کی سطح پر پہنچا دیا۔ میرا سانس ٹوٹ رہا تھا۔ پانی سے باہر آتے ہی میرے ناک کے نتھنوں نے بڑی بے صبری سے آکسیجن کو اپنے پھیپھڑوں

میں اتارا ۔ تین چار لمبے لمبے سانس سینے میں بھرنے کے بعد میں۔۔۔ دوبارہ پانی کے اندر چلا گیا۔ میرا اندازہ درست تھا ۔ شارک بری طرح زخمی تو ہوگئی تھی لیکن ابھی مری نہیں تھی۔ کسی ریل کے انجن کی طرح غراتی، جھومتی اپنے زخموں کا انتقام لینے بڑھی چلی آرہی تھی۔ اس بار اس کا حملہ بڑا سلوموشن میں تھا۔

۔۔۔ میں نے بڑے پرسکون انداز میں اس کے قریب پہنچنے کا انتظار کیا۔ اس بار اس نے اپنا بھیانک منہ حملے کے آغاز سے ہی کھول رکھا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے نوکیلے دانتوں کی قطار سے خون کا ایک ریلہ سا باہر نکلتے دیکھا پھر بڑی تیزی سے جُھکائی دے کر اس کے جسم کے نیچے چلا گیا اور پھر خنجر کے کئی وار اس کی گردن کے نیچے کئے۔ تکلیف کی شدت سے تڑپتے ہوئے اس نے اپنی گردن کو بری طرح جھٹکا دیا۔ میرے کندے پر اس کا ہلتا ہوا جسم لگا اور میں ایک جھٹکے سے پانی کے مزید نیچے جانے لگا لیکن میں نے۔۔۔ اوسان بحال رکھے ۔۔۔ اور ایک الٹی قلابازی کھا کر خود کو پانی کی اوپری سطح پہ لے گیا۔ ہاتھ پاؤں ہلاتے اور پانی میں اوپر جاتے ہوئے میں نے دیکھا پانی کبھی سرخ ہو رہا تھا اور کبھی نیلا اور اس نیلے سرخ پانی میں نیلی شارک کا مُردہ جسم پانی کا ہی ایک حصہ بننے بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ پانی کی سطح پر پہنچتے ہی میں نے کئی لمبے سانس لئے۔ ایک صبر آزما اور خونی جنگ نے میرے اعصاب شل کردیئے تھے۔ شارک مرچکی تھی اور میں ابھی زندہ تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا لیکن مجھے یقین کرنا پڑا۔

ساحل مجھے اپنے بالکل قریب نظر آرہا تھا لیکن مجھے وہاں تک پہنچنا عذاب دکھائی دے رہا تھا۔ میرے جسم کی حالت اس مزدور کی سی تھی جو صبح سے لے کر رات تک مسلسل مشقت کا کام کرتا رہا ہو ۔۔۔ پھر میں نے ہمّت کی اور جسم کی بچی کھچی توانائی۔۔۔ جمع کرکے تیرنا شروع کردیا۔ میرے سن ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں بڑی تیزی سے پانی کی سطح کو کاٹنے لگے اور میں ساحل کی طرف اس طرح بڑھنے لگا کہ جیسے بالکل تازہ دم ہوں۔۔ ۔اس کی ایک وجہ میرے ذہن میں موجود وہ خوف بھی تھا کہ مرنے والی شارک اکیلی نہ ہوئی تو اس کا ساتھی یقیناً" اس کا انتقام لینے اب تک میری طرف چل پڑا ہوگا۔۔۔!! (جاری ہے)

پاکستان میں

پاکستان میں ان گنت دریا اور ندیاں ہیں جبکہ دنیا کے ۱۶ ملکوں میں ایک بھی دریا نہیں۔ پاکستان میں گنا گندم کپاس اور چاول پیدا ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے ۴۵ ملکوں میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں۔ پاکستان کو قدرت نے قدرتی گیس کے ذخائر سے نوازا ہے جبکہ دنیا کے ۷۷ ملک اس نعمت سے محروم ہیں۔

مرسلہ: اظہر خان، کراچی

کوپن برائے "سالانہ خریداری"

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتا _____

_____ فون نمبر _____

کوپن برائے "ہیرو کے مہمان"

نام _____ تاریخ پیدائش _____ جماعت _____

تعلیمی ادارہ _____ مشغلہ _____

پتا _____

_____

کوپن برائے "تحفہ آنکھ مچولی"

میرے دوست کا نام _____

جماعت _____

گھر کا پتا _____

_____

کوپن برائے "سب سے بہترین"

سب سے اچھی کہانی _____ مصنف _____

سب سے اچھی نظم _____ شاعر _____

بھیجنے والے کا نام اور پتا _____

_____

سُنا ہو تو سُنائیے
دیکھا ہو تو بتائیے
کوئی ایسا ماہنامہ
جِس نے

◎ مُنفرد موضوعات پر ہر سال دو خاص نمبر شائع کئے ہوں۔

◎ جس کی سطر سطر تحقیق اور لفظ لفظ تخلیق سے عبارت ہو۔

◎ جس کے خصوصی شمارے اپنے موضوعات پر مُستند کتاب کی طرح مستقل علمی حوالہ بن گئے ہوں۔

◎ جس نے اپنے خاص نمبر کے ساتھ انوکھے اور حسین تحائف دینے کی رسم ڈالی ہو۔

◎ اور جس نے مختصر ترین وقت میں لامحدود اشاعت کا ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اگر آپ ایسا ماہنامہ کہیں تلاش کر پائیں تو ہمیں ضرور مطلع کریں

ماہنامہ
آنکھ مچولی

1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

آخری بات

14 اگست ہماری آزادی کا دن ہے۔ اس کو منانے کے لئے ہر سال جس جوش وجذبے کا اظہار کیا جاتا ہے وہ قابلِ دید ہوتا ہے مگر اس کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم خوشی کے ان لمحات میں قومی بے حسی کا مظاہرہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔۔۔۔ خصوصاً" قومی پرچم کی بے حرمتی کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے جسے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے ہر سال لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں جو جھنڈے اور جھنڈیاں استعمال ہوتی ہیں، ہم انہیں سنبھال کر رکھنے کی بجائے زمین پر پھینک دیتے ہیں ان کی زیادہ تر تعداد تو ہمیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر نظر آتی ہے یا پھر گندے پانی کی نالیوں میں۔۔۔ زندہ قومیں اپنے اپنے جھنڈوں کی بہت عزت کیا کرتی ہیں اور کسی صورت میں بھی ان کی توہین برداشت نہیں کرتیں یعنی اگر کوئی دشمن ہمارے قومی پرچم کی توہین کرے تو ہم سراپا احتجاج بن جاتے ہیں، اسے مارنے مرنے پر تُل جاتے ہیں لیکن یہ بات کتنی افسوس ناک ہے کہ ہم خود ہی اپنے جھنڈے کی توہین کرتے ہیں۔ آیئے آج کے دن ہم یہ عہد کریں کہ جھنڈے کا احترام کریں گے اور اسے زمین پر گرنے سے بچائیں گے۔ آیئے! آج ہی سے ایک روشن اور زندہ قوم بنیں!!

نورس
UQRA
شربت نورس انتہائی کاوش، جدید ترین مشینری کی مدد اور ماہرین
کی انتھک کوششوں کو یکجا کر کے سائنٹیفک اصولوں کے تحت تکمیل
کو پہنچتا ہے۔ نورس کا ذائقہ ہی اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا ایک
ایک گھونٹ مفرح اور صحت بخش ہے۔ اسے دودھ، آئس کریم، کسٹرڈ اور
قلفی میں استعمال کرنے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے اور موسم برسات
میں تازہ لیموں کے ساتھ نورس فریش لائم موسم کے مضر اثرات
سے محفوظ رکھتا ہے۔
قومی مشروب
نورس
احمد فوڈ انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
021-2564570
2563520
ORIENT

Colorscan

REGD. No. M-266 AUGUST 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

APPETA Finger Chips

A -IS FOR APPETA

B -ECAUSE.... APPETA IS THE BEST

C -CHILDREN LOVE US

D ON'T BUY ANY OTHER CHIPS...

E NJOY APPETA

F -INGER CHIPS

ذائقے کی دُنیا میں

A IS THE APPETA

32-33, Industrial Triangle Estate, Kahuta Road, Islamabad, Pakistan. Phone: 51-490471-4 (PABX-4 Lines) Fax: 51-491117-4, Telex: 54421 A. R. PK.